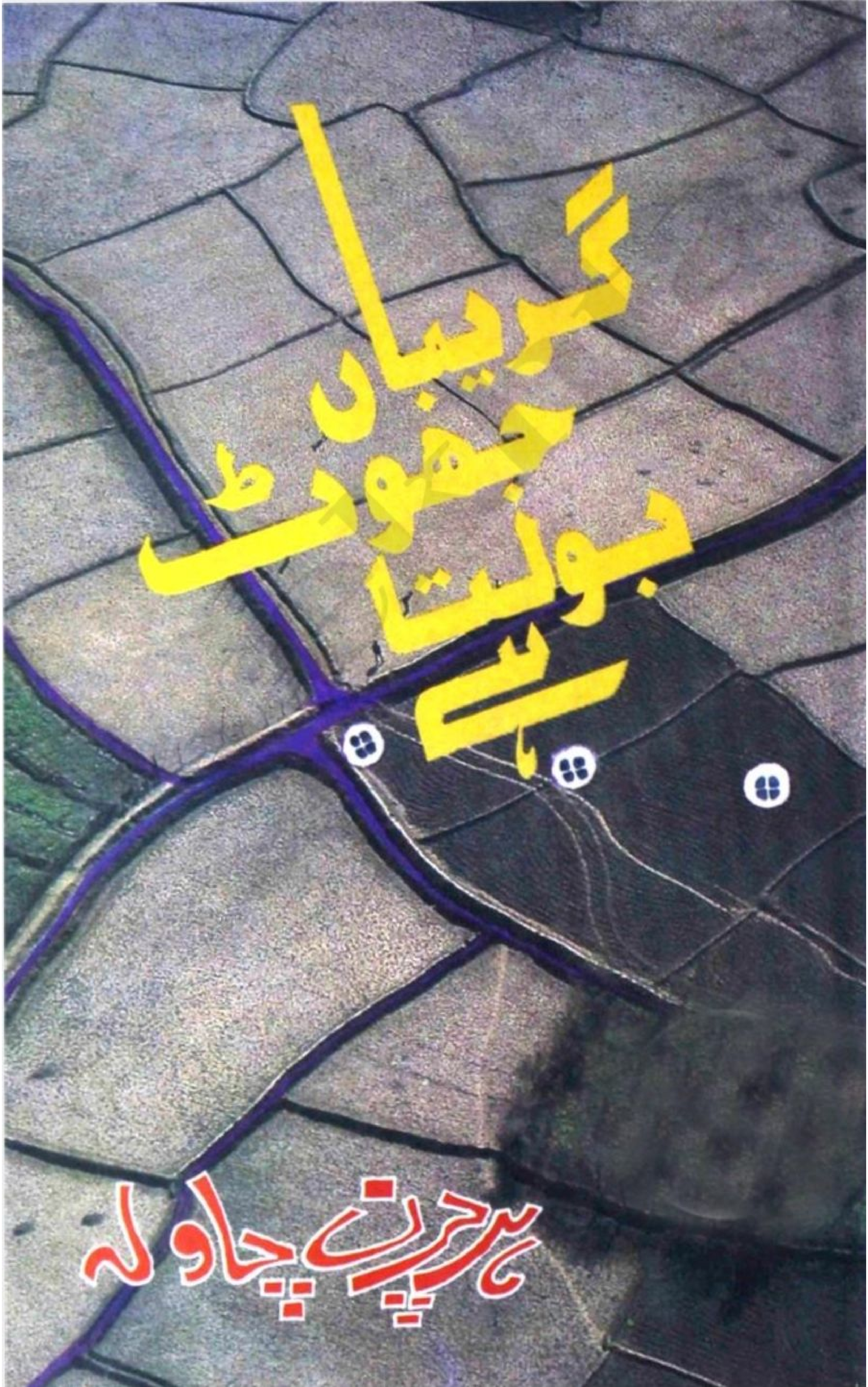

گریباں جھوٹ بولتا ہے
ہرچرن چاولہ

گریاں جھوٹ بولتا ہے

rekhta

عقابی

عقابی کتب خانہ ریختہ سپیشل

This e book is
Scanned by
UQAABI

03055198538

گریباں جھوٹ بولتا ہے

(افسانے اور افسانچے)

ہرچرن چاولہ

ادارہ فکرِ جدید

۹۲۲۔ کوچہ روہیلا خان۔ دریا گنج

نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

rekhta

(جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ)

قیمت : ایک سو پچاس ۱۵۰/- روپے
سنِ اشاعت : ۱۹۹۶ء
طباعت : انیس آفسیٹ پریس۔ نئی دہلی

ناشر : اِدارہ فکرِ جدید
۹۲۲. کوچہ روہیلا خان۔ دریا گنج۔
نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲

GAREBAAN JHOOT BOLTA HAI
Short Stories

HARCHARAN CHAWLA
Price Rs. 150.00

IDARA FIKRE JADEED
922, Kucha Rohella Khan
Darya Ganj, New Delhi-2.
Phone : 3281880

ISBN 81-85785-21-X

rekhta

ترتیب

افسانے

1 . گریباں جھوٹ بولتا ہے	7
2 . سچ جیسے سپنے	17
3 . ٹمپل روڈ	23
4 . قفس	27
5 . جیگلو	31
6 . سٹینڈ بائی	37
7 . بیوی یا بیماری	45
8 . جھوٹ + جھوٹ = سچ	49
9 . پسِ دیوار	55
10. سانپوں کا جوڑا	61
11 مسز رِچ	65
12. وہ کہاں ہے ؟	71
13. دریا اور کنارے	75
14. مارگزیدہ	79
15. انگارہ	91
16. ڈھائی اکھر	97
17. فسانے پیار کے لکھوائے تو کوئی ہم سے لکھوائے	101
18. زخموں کے سوداگر	107
19. سُلگتے آنسو پگھلتے پتھر	115
20. کہانی بدلتی ہے	121

rekhta

افسانچے

21. مکتی پتھ 127

22. عورت 129

23. مدر ٹنگ فادر ٹنگ 131

24. دائرہ 133

25. تمنّا کے سُر 135

26. نتیجہ 137

27. نیا رنگ 139

28. کبیرا ہنسا بھی اور رویا بھی 141

29. کتاب 143

30. ایمرجنسی 145

31. دُکان 147

rekhta

گریبان جھوٹ بولتا ہے

چودھری صاحب۔ آپ اتنے لوگوں کی کہانیاں لکھتے ہو، لکھتے ہو، لکھتے ہو نا تو میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے کہ میری زندگی —— میری زندگی، میں کہتا ہوں۔ کیا کمی ہے کہ میری زندگی سے آپ کو کوئی کہانی نہیں ملتی۔ میں آپ کو سُناتا ہوں اپنی کہانی۔ کیا کہا میں نے۔ اپنی کہانی، جو آپ کی کہانی بھی ہے وہ اس طرح کہ آپ کہانی کار ہیں تو لکھنے کے بعد کہانی آپ ہی کی تو ہو جائے گی۔ . . . آپ سُن رہے ہیں کہ میں ایسے ہی بک بک کر رہا ہوں۔ بک بک۔ بکواس کر رہا ہوں —!

وہ لفظوں کو پتلا کر کے بولتا۔ موٹا کر کے اُچارن کرتا، آواز اُدپر لے جاتا، پھر ایک جھٹکے سے نیچے گرا دیتا۔ وہ اپنی کہانی سُنا رہا تھا۔ جو اصل میں اس کے باپ کی کہانی تھی —— کہ اس کی ساری زندگی میں اُس کے باپ کی پوری کہانی بلکہ پوری زندگی گھسی پڑی تھی جیسے کانٹے دار تاروں کے گچھے ایک دوسرے میں گھس جاتے ہیں، تو گروپ فائٹ کی طرح ایک دوسرے سے اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ پہچاننے مشکل کہ کون کس سے گتھم گتھا ہو رہا ہے۔ کون کسے مار رہا ہے، کیا مار رہا ہے۔ وہ کہانی تو اپنے باپ کی سُنا رہا تھا۔ یا کم از کم اس نے اُسے باپ سے وابستہ کر رکھا تھا۔ مگر وہ اس کے باپ سے زیادہ لفظوں کی اُٹھک بیٹھک، اُتار چڑھاؤ۔ لکن جھکن سے اُس کی اپنی کہانی زیادہ محسوس ہوتی تھی میں نے کہا۔

"دلدار خاں۔ یہ تو تیری اپنی ہی کہانی لگتی ہے۔ جیسے تو ہی اپنے باپ کا باپ ہو!"

ٹھیک کہتے ہو چودھری صاحب۔ میں اپنے باپ ہی کا بیٹا ہوں تو اُس کا باپ بھی ہوں۔ آپ نے سُنا ہو گا کہ چائلڈ از دی فادر آف مین — اور مجھے افسوس ہے کہ میں اُس ناخلف والد کی اولاد ہوں۔ تبھی تو میں اس کا باپ بھی لگتا ہوں۔ اگر نہیں تو اپنے بیٹوں کا ویسا ہی باپ بنوں گا۔ جیسا میرا باپ میرا باپ ہے۔ اور اُس میں میرا کوئی قصور نہیں ہو گا۔ وہی میرے باپ کی بیچ میں ٹانگ اڑی ہوئی خون کی ندی تو سات پُشتوں تک ایک ہی راہ بہتی ہے دیکھو چودھری صاحب۔ جو کچھ میرا پردادا، دادا اور باپ سیکھ چکے ہیں۔ وہی سیکھ تو خون کی راہ میرے دل و دماغ میں آ چکی ہے۔ اب میں نے اُسے آگے بڑھانا ہے اور بڑھاؤں گا ہی۔ میں راہ نہیں بدل سکتا۔ ہاں کوشش کر سکتا ہوں جو میں پوری طرح ضرور کروں گا۔

"آپ میری بات سمجھ رہے ہو کہ میں یوں ہی آپ کے سامنے بک بک کر رہا ہوں۔" وہ میری طرف دیکھتا کچھ دیر چپ بیٹھا رہا۔ ۔ ۔ ۔ پھر اپنے آپ بولنے لگا۔

"اسی لئے کسی نے کیا خوب کہا ہے: ماں پر پوت، پتا پر گھوڑا!

بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا

یہ مثل کسی نے دل بہلاوے کو گھڑ دی ہوگی۔ تھوڑا تھوڑا۔ یار تم کسی کو بھی دیکھ لو۔ ہو بہو اپنے اصلی باپ کی کاربن کاپی نظر آئے گا۔ غلط کہہ گیا ہوں۔ غلط کہہ گیا ہوں۔ رک جا ذرا۔ تم رک جا ذرا۔ فوٹو کاپی نظر آئے گا۔ کاربن کاپی اور اوریجنل میں بھی تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے۔ مگر فوٹو کاپی تو سالی کبھی کبھی اوریجنل کا دھوکہ دے جاتی ہے۔ دھوکہ کہاں دے جاتی ہے، لگتی ہی اوریجنل ہے۔"

"تم یار اپنی کہانی کہو یا تمہید ہی باندھتے رہو گے۔ جب تمہاری تمہید ہی اتنی طویل ہے تو کہانی تو پورا گرنتھ ہوگا۔" میں نے اُسے لڑکا۔

"نہیں یار کوئی گرنتھ ورنتھ نہیں۔ سیدھی سادی ست یگ کے باپ اور کل یگ کے بیٹے کی کہانی ہے۔ دراصل میں نے تیری خوشی کے لئے باپ کے ساتھ ست یگ کا اور بیٹے کے ساتھ کل یگ کا زمانہ جوڑ دیا ہے۔ ورنہ تیرا تاریخ دان ذہن یہ گولی ہضم نہیں کر سکے گا۔ اور تو بدک کر کرسی چھوڑ دے گا۔ تو یار ذرا برداشت کا بٹن آن کر کے بیٹھ تو تجھے بتاؤں کہ یہاں معاملہ برعکس ہے یعنی باپ کل یگی اور بیٹا ست یگی ہے یعنی بیٹے کے معاملے میں گردشِ زمام پیچھے کی طرف لوٹ رہی ہے۔ دیکھ میں تیرے لئے ہندو مائتھولوجی کے حوالوں سے بات کر رہا ہوں۔ وہ دراصل ان دنوں یار رامائن کے سیریل گھر پر دیکھ رہا ہوں نا۔ اس لئے۔ تو یار چپ رہ اور غور سے میری کہانی سن۔"

"اچھا بھائی۔ میں چپ رہوں گا۔ اور چپ کے سوا اور کچھ نہیں کہوں گا۔ تو اپنی کہانی کہہ۔"

"تو راجہ ماں سے پیدا ہوتے ہی، میرا مطلب ہے پیدا کرتے ہی میرا نام راجہ رکھ دیا۔ دراصل گھر میں باپ راجہ بنا بیٹھا تھا تو ماں نے سوچا اس کے مقابلہ پر گھر میں ایک اور راجہ پیدا کر لیا جائے تو اُسے سکھ کا سانس لینا نصیب ہو۔ برابر کا راجہ، میں بچپن ہی میں باپ کی گود میں فارغ ہو لیتا اور اُسے اپنی بدبوؤں کی فوج سے میدانِ جنگ سے بھاگنے پر مجبور کر دیتا۔ اگر کبھی وہ قدم جمانے کی کوشش کرتا تو میں موقع دیکھ کر اس کی چھاتی پر سوار ہو جاتا اور اُس کے منہ کا نشانہ باندھ کر سیدھی دھار اُس کے دہانے پر چھوڑ دیتا۔ وہ تھو تھو کرتا اُٹھتا۔ کبھی کبھی بھلے ایک آدھ زوردار تھپڑ بھی جڑ دیتا اور اپنی بے شمار گالیوں کی بوچھاڑ کا رُخ میری ماں کی طرف کر دیتا۔ تب میں اگلے حملے کے لئے تیار چند روز کے لئے ماں کی گود کے مورچے میں پناہ گزین ہو جاتا۔ اور جب میں دوبارہ شب خون مارتا تو وہ بوکھلا جاتا۔ ماں سے کہتا۔ "سالی یہ تو نے ہرناکش کے گھر میں پرہلاد کیوں پیدا کر دیا۔ میری راہ سے کہیں بھی اس کی راہ نہیں ملتی۔ کہیں سسری باہر سے تو۔ ۔"

آہستہ آہستہ میرے باپ کو احساس ہونے لگا کہ خود اس کے ایک راجہ کے ہوتے ہوئے گھر یعنی ایک کمرے ایک باتھ روم اور ایک کچن کی سلطنت میں دوسرے راجہ کا کیا کام؟ اور پھر ڈائرکٹ راجہ؟ نہیں چلے گا۔ اس نے میری ماں

سے کہا۔ یہ سالا پرنس ہونا چاہیے تھا تو نے ڈی گریٹ میرے مقابلے پر راجہ کہاں سے لاکھڑا کر دیا۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نہ صرف باپ کے گھر کی طویل و عریض سلطنت کا راجہ بن چکا تھا بلکہ گلی محلے اور سکول تک میں بھی ساجہ کہلانے لگا تھا۔ چنانچہ میرے باپ نے، تم دو تو ہم بھی دو۔ کے برابری کے اصول پر دن رات محنت کر کے اپنا ایک ساتھی پیدا کر لیا میری ماں تو اس کا نام اکبر رکھنا چاہتی تھی مگر میرا باپ چڑ گیا۔ اکبر؟ سالا گھر میں ایک ہی راجہ کیا کم ہے کہ دوسرا مہاراجہ پال لوں۔ ایک مُنہ میں پیشاب کرتا ہے۔ دُوسرا سر پر طبلہ بجا بجا کر میرے بچے کھچے بال بھی اُڑا دے گا ــــ نا بابا نا ــــ یہ پرنس ہوگا تاکہ آرام سے وقت پر گدی سنبھال سکے وہ بھی تب جب میں خود خالی کر دوں۔ چنانچہ میرے بھائی کا نام پرنس رکھ دیا گیا۔ اور پھر پرنس کو اتنا پیار دیا جانے لگا کہ میں گھر میں عضوِ معطل بن کر رہ گیا۔ باپ اس پر بھی بس کر جاتا تو کوئی بات بن جاتی، مگر وہ تو مجھے ایک آنکھ نہ دیکھ سکتا اور اس کا رویہ گھر میں میرے ساتھ یُوں ہوتا جیسے گھر میں وہ رہے گا یا میں۔ وہ میرے بہانے ماں کو تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ وہ گھر میں کسی دوست یا رشتہ دار کی دعوت کرتی تو وہ خاموش رہتا۔ بلکہ کئی بار تو ایسی کسی دعوت پر اپنی رضامندی دینے کے باوجود عین مہمان کے سامنے کوئی نہ کوئی ایسی حرکت یا تلخ بات کر دیتا کہ ماں کے پکے پکائے اچھے بھلے پُر ذائقہ کھانوں میں سیروں نمک اور مرچ پڑ جاتے اور مہمان تھُو تھُو کرتے بھاگ جاتے۔ کسی بھی رشتہ دار کی شادی بیاہ پر بھی وہ عورتوں کی طرح رُوٹھ کر گھر بیٹھ جاتا اور اُوپر سے اوپر والا بھی اُٹھ کر آ جاتا تو اس کے بھی ابا میاں کو منانے کے سارے گُر فیل ہو جاتے۔ ماں نے سوچا۔ سارے فساد کی جڑ میں ہوں۔ نہیں میں شاید غلط کہہ گیا ہوں۔ مائیں ایسا نہیں سوچا کرتیں۔ ایک طرف وہ خود، ان کے میاں اور پرنس چارلس تھے دوسری طرف اکیلا میں۔ ماں نے سوچا۔ گھر اور تین جیُوں کو بچانے کے لئے ایک کو قربانی کا بکرا بنا لینے میں کوئی حرج نہیں اور وہ مجھے ابا جان کے ایک دوست کے ہاں چھوڑ آئیں، جن کے اپنے کوئی اولاد نہ تھی ــ اور ایک عرصہ سے وہ مجھے اُن سے مانگ رہے تھے، کاش وہ جانتیں کہ ایک بچہ جو چھ سات سال ماں باپ کے پاس رہ چکا ہو، چاہے وہ جیسے بھی ہوں اُسے کسی دوسری جگہ نہیں ڈالنا چاہیئے۔ تم سُن رہے ہو یا میں ایسے ہی بولے جا رہا ہوں؟"

"یار تم کہتے جاؤ۔ اب کچھ بات بننے لگی ہے۔" میں نے کہا۔ "پہلے تو تم بھیجہ چاٹ رہے تھے۔"

"سالے تماش بین ــــ دُوسرے کا گھر جلتا دیکھ سب ہاتھ سینکنے پہنچ جاتے ہیں۔" وہ اپنی رو میں کہہ گیا۔

"دیکھ گالی مت بک۔ سُسری کہانی میں گرمی نہیں ہوگی تو اُسے کون سُننا پسند کرے گا۔" میں نے شکایت کنا لہجے میں کہا جیسے کانوں کی کھڑکیاں بند کر لیں تو وہ سُنائے گا کس کو؟ "مگر یار ایک بات سمجھ نہیں آ رہی۔ باپ ایسے تو نہیں ہوتے۔ بات کچھ دِل کو جچتی نہیں کہ ......"

"تو ٹھیک کہتا ہے۔ میں نے اس پر بہت وچار کیا ہے۔ میں نے دیکھا اور سُنا بھی ہے۔ میری ماں لاکھوں میں ایک تھی۔ اور اب بھی حُسن میں ہزاروں سے آگے ہے اور میرا باپ بس عقل اور شکل دونوں سے پیدل۔ وہ نوکری کرتی تھی اور تنخواہ میرے باپ سے دُگنی لاتی تھی۔ دونوں طرف کی مار نے اُسے شکّی مزاج بنا دیا تھا۔ ماں ذرا بھی دفتر سے لیٹ آتی تو اُسے شکوک

کے دورے پڑنے لگتے۔ وہ ماں سے جھگڑتا تو میری دادی بھی میری ماں کی طرف دار بن جاتی۔ اُسے اپنی بہو پر پورا ناز تھا۔ نتیجتاً وہ احساس کمتری کا شکار ہوتا گیا۔ دوسرے اُس کا ابھی تو جوان اور خوبصورت بیوی کی محبت سے اپنا دل بھی پوری طرح نہیں بھرا تھا کہ بیچ میں حصہ بٹانے میں تشریف لے آیا۔ بس اس نے مجھے رقیب ہی سمجھ لیا۔ بناوٹ لا کہوں تو زیادہ مناسب ہوگا۔

"یار کہیں سچ ہی معاملہ دوسرا نہ ہو۔ تم کسی اور کی کوشش کا نتیجہ۔ ۔ ۔"

"کمینے پھر چونچ مار گیا نا۔ ارے میری ماں کی شرافت کی تو لوگ قسمیں کھاتے ہیں۔ میری دادی تک کو اس کی پوترتا پہ مکمل یقین تھا۔"

"خیر تو آگے چل۔"

"یار تو بیچ میں لنگڑی مت مارا کر۔ میرے منہ سے گالی نکل جاتی ہے۔ تو سن رہا ہے تو میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے تو دوست ہے ایسے ویسے الفاظ زبان سے پھسل جائیں تو معاف کر دیا کر۔ تو میں کہہ رہا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا۔ ہیں ذرا یاد دِلا تو آگے بڑھوں یار تو بیچ میں ہولا مت کر میرا خیال بٹ جاتا ہے۔"

"ماں نے تجھے ایک دوست سے ہاں چھوڑ دیا۔ مگر تیرا دل وہاں نہیں لگتا تھا" میں نے اُسے سہارا دیا۔ اُسے یہ جتانا فضول تھا کہ وہ خود ہی بیچ میں اپنی بات روک دیتا تھا۔

"پہلے نہیں لگتا تھا۔ بعد میں تو لگنے لگا۔ کبھی کبھی چھٹیوں میں گھر آنا چاہتا تو ابا جان پڑھائی کے بہلنے آنے سے روک دیتے۔ لکھتے۔ وہیں رہو۔ اور محنت کرو۔ مگر ماں کا خون جوش مارتا تو وہ ہی میرے پاس ہفتہ دس دن کے لئے آ جاتی اور سے چوری چھپے پیسے اور ماموں جان کو خرچہ پہنچا جاتی۔ ہاں اب میں اُنھیں ماموں کہنے لگا تھا۔ مگر پھر پرنس اور ابا کی روٹی اور روزی کا چکر اُسے جلدی ہی واپس لے جاتا۔ روٹی کی بات یہ تھی کہ دونوں باپ بیٹا اپنے ہاتھوں کچن سے پانی کا گلاس تک پینے کے روادار نہیں تھے۔ بڑے فخر سے کہتے۔ ہم تو اپنے ہاتھ سے پانی کا گلاس تک نہیں چھوتے اور روزی کا معاملہ اس طرح تھا کہ ماں اپنی تنخواہ ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے ابا میاں کی ہتھیلی پر دھر دیتی تھی۔ خدا جانے اُس کی کون سی رگ ابا میاں سے دبتی تھی کہ ہر وقت اُس کے آگے بھیگی مرغی بنی رہتی تھی۔

"بھیگی بلی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"پھر تم۔ ۔ ۔ ؟ جیسے تیسے لم لڑھک کر میں نے میٹرک کر لیا۔ ماں مجھے آگے پڑھانا چاہتی تھی مگر میں ڈال سے ٹوٹے پھل کی طرح ایک ہی جگہ کا ہو کر رہ گیا۔ بچہ تو پیار کی کھاد سے پلتا بڑھتا ہے۔ میری زندگی کے پودے پر تو شروع ہی سے کھاد ندارد تھی۔ میں ٹھنگو سا رہ گیا اور چڑچڑا بھی ہو گیا۔ پھر ماموں جان کے ہاں اپنا لڑکا بھی پیدا ہو گیا۔ تو میں وہاں فضول کی چیز بن کر رہ گیا۔ اس لئے اب میں ماموں کے ہاں کیوں رہتا یا وہ مجھے کیوں رکھتے۔ پرائی اولاد کو بہت دن برداشت کر لیا اور ایک دن وہ مجھے میرے گھر چھوڑ گئے۔ بہانہ یہ بنایا کہ لڑکا پڑھتا دڑھتا تو ہے نہیں۔ باپ نے کہا۔ نہیں پڑھتے تو نہ پڑھو۔ مرد اور کوئی نوکری کرو۔ روٹی مفت نہیں ملتی۔ کام کرنا پڑتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ دِل سے چاہتے بھی نہیں تھے کہ میں اُن پر مزید بوجھ بنوں۔

اُدھر ماں چاہتی تھی میں کچھ دن گھر پر رہوں۔ آرام کروں اور اُس کے ہاتھ کی پکی روٹیاں کھاؤں تو میرا قد بُت نکلے مگر ابا میاں کے آگے اُس کی ایک نہ چلی۔ وہی کہیں کوئی رگ دبنے والی بات تھی بیچاری دُم دبا کر بیٹھ رہی اور میں ایک دوست کی دکان پر موٹر پارٹس کی سیل کا کام سیکھنے لگا۔ اب میں کماؤ پوت باپ کو کچھ کچھ اچھا بھی لگنے لگا تھا۔ مگر پھر نہ جانے کون سے جنم کی دشمنی اچانک اس کے اندر جاگ اٹھتی کہ گھر میں میرا وجود ہی اُسے اکھرنے لگتا کبھی اُسے میری تنخواہ کم محسوس ہوتی۔ اور کبھی میرا جیب خرچ زیادہ لگنے لگتا۔ جو ایک آدھ چائے کے پیالے اور آنے جانے کے بس ٹکٹ تک محدود تھا۔ تب مجھے ہندو دھرم کے، پچھلے جنم کے کرموں کے پھل، پر وشواس ہونے لگتا۔ میں سوچتا میں نے ضرور کسی پچھلے جنم میں ابا جان کے باوا کا کوئی کھیت اجاڑا ہوگا۔ جس کا بدلہ وہ مجھ سے اس جنم میں لے رہے ہیں، اپنے بچپن کی شرارتوں کا، جن کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے وہ تو میں نے ایسے ہی اپنا غصہ نکالنے کو یہ رُوپ دے دیا ہے۔ ورنہ کون بچہ اپنے ماں باپ سے لاڈ نہیں کرتا۔"

کہانی چل پڑی تھی تو اُس کی زبان میں روانی بھی آگئی تھی اور اُس میں سے لفظوں کی وہ اٹھک بیٹھک الٹکن بھٹکن کہیں ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئی تھی۔ کہتے ہیں۔ ہکلا آدمی بھی گاتے ہوئے ہکلاتا نہیں

"باپ نے بہت تنگ کیا تو میں نے کہا۔ ابو۔ کچھ پیسے دو تو اپنی دکان ڈال لوں۔ جن کے ہاں کام کرتا ہوں، اُن سے زیادہ تو خود مجھے موٹر پارٹس کا علم ہے۔ ایک طرح سے کام میں کرتا ہوں۔ اور گدی پر بیٹھے کماتے وہ لوگ ہیں۔ اپنا پیسہ ہوگا تو اپنی کمائی اپنے گھر میں آئے گی۔

باپ کو میری بات سمجھ نہیں آئی۔ یا وہی کوئی پچھلے جنم کا بیر اُن کے دل میں عود کر آیا۔ بولے: "پیسہ، کہاں ہے پیسہ؟ سارا تو تم نکموں اور گھر پر خرچ ہوتا رہا ہے۔"

ماں بولی۔ "ٹھیک ہے تمہارے پاس پیسہ نہیں تو اس کے دادا جان کی چھوڑی ہوئی جائیداد سے ہی اس کا حصہ دے دو۔ چھوڑا کسی راہ تو لگے۔"

"دادا جان" ابا میاں نے منہ چڑایا۔ "تو چپ رہ اَدھ پگلی پتہ تو تجھے کچھ چلتا نہیں۔ اور بیچ میں ٹانگ اٹکا دیتی ہے۔ اس کے دادا نے اس کے لئے ایک لال پیسہ بھی نہیں چھوڑا۔"

میں جانتا تھا۔ ابا میاں صاف جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں اب جوان ہو چکا تھا کبھی کبھی اُن کے سامنے بول بھی پڑتا تھا مگر اس کا خمیازہ امی کو بھگتنا پڑتا تھا۔ اس لئے میں چپ رہ گیا۔ میں نے سوچ لیا کہ میں اس گھر میں حادثتہً پیدا ہو گیا ہوں اس لئے میں اس بجائے حادثہ سے جتنی جلدی دُور بھاگ جاؤں، اُتنا ہی میرے اور میرے گھر والوں کے لئے فائدہ مند ہوگا۔ مگر ایک بیڑی تھی پاؤں میں جو مجھے کہیں نکل جانے سے روکتی تھی۔ عائشہ مجھے بس شاپ پر روز ملتی تھی۔ ایک آدھ بات بھی ہو جاتی تھی۔ بس کب گئی۔ دوسری کب آئے گی۔ آئیے سکوٹر لے لیں۔ کرایہ آدھا آدھا بانٹ لیں گے۔ بات اتنے تک رہتی تو میں دھوکہ نہ کھاتا۔ مگر وہ دیکھتی بھی کبھی کبھی ایسی نظروں سے تھی کہ خواہ مخواہ اپنے آپ پر پیار آنے لگتا تھا۔ ایک دن میں اُسے ایک بہت اچھے ریستوران لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد حوصلہ یک جا کیا اور کہا۔

"عائشہ آؤ۔ اب ایک ہو جائیں۔"

"آپ نے یہ بات اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے کہہ دی ہے۔ ابھی تو ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے بھی نہیں۔ سرسابے کبھی کبھی ملاقات کو بہت تو نہیں کہا جا سکتا۔ بائی دی وے۔ آپ کام کیا کرتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"کشمیری گیٹ میں ایک موٹر پارٹس کی دکان پر سیلزمین ہوں۔" میں نے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا۔

"یعنی محل بناتے ہو، اُن میں رہتے نہیں۔"

"ہاں فی الحال تو کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔"

"تو ایسا کرو مسٹر۔ ۔ ۔ ۔"

"راجہ"

"مسٹر راجہ، میرا نام سن کر اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی ہنسی کی لکیر تیر آئی۔ "اچھے بچے بنو، کام سیکھ لو۔ اور جب اپنا سٹور رہنا تو تب کسی لڑکی سے شادی کی بات کرنا۔"

"شکریہ۔ عائشہ دیوی۔ آپ نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ اب مجھے فرار ہونے میں کوئی دقت نہیں ہوگی۔" اور میں نے دل کے دروازے پر تالا لگا کر چابی کہیں گم کر دی

انگلینڈ بڑے ناجائز طریقے سے میری انٹری ہوئی۔ اس کی کہانی دوسری ہے۔

انگلینڈ میری انٹری بڑے ہی نامناسب طریقے سے ہوئی۔ یار تو پھر غیر حاضر ہے اسی لئے مجھے فقرے بار بار دہرانے پڑتے ہیں۔ تم کہانی کار لوگ، ایک کہانی جو تمہارے سامنے کبھی جاری ہوتی ہے، کو چھوڑ کر کسی دوسری رنگ برنگی تتلی جیسی کہانی کے پیچھے بچے کی طرح دوڑنے لگتے ہو۔ ایک ہی وقت میں کئی تتلیاں تمہارے ذہن کے آکاش پہ اُڑتی رہتی ہیں۔ شاید تم اس لئے بے دھیان ہو جاتے ہو کہ میری کہانیوں میں تتلیوں جیسا رنگ اور خوبصورتی نہیں کیا تم بدصورت کہانیاں نہیں لکھتے۔ لکھتے ہو چودھری بھائی۔ ابھی میں نے چند ماہ پہلے تمہاری ایک کہانی کہیں پڑی تھی۔ بڑی بد وضع، کریہہ اور بدبودار کہانی تھی۔ بھبکے اُڑ رہے تھے اس میں سے بدبو کے، کہ پڑھتے ہوئے کئی بار ناک پر رومال رکھ لینا پڑا۔ مگر سالی میں گرفت بہت تھی۔ بس باندھ کر بٹھائے رکھا اختتام تک۔ یار تم کہانی کے پر ایسے باندھتے ہو کہ کہیں اُڑ نہیں سکتی۔ بیچاری قاری کی گود میں پھڑپھڑاتی اور پُردرد راگ گاتی رہتی ہے۔

"اے۔ اے مہاشے۔ کہاں کھو گئے۔ اپنی تعریف کے ساگر میں غوطہ زن ہو گئے۔ باہر نکلو۔ میری کہانی سنو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ میں کیا کہہ رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ہاں یاد آیا۔ تم ذرا جاگو تو آگے چلوں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ انگلینڈ میں میری انٹری بڑے ناجائز طریقے سے ہوئی مگر بات بن گئی وہ یوں کہ۔

اِک رات کو پکڑے گئے دونوں زنجیر سے جکڑے گئے دونوں

یار گوری چھوری نے تو پہلے ہی مجھے زنجیرِ زلف میں گرفتار کر رکھا تھا۔ اوپر سے قانون کی زنجیر گلے آپڑی۔

میں نے چھوری سے کہا۔

اب میری لاج تیرے ہاتھ ہے۔ ورنہ دودھ کی مکھی کی طرح باہر جھٹک دیا جاؤں گا۔

کیا خیال ہے تھوڑی دیر کا انٹرول کرلیں۔ تم نیند کے جھٹکے کھاتے ہو تو بات کرنے کا مزا کرکرا ہو جاتا ہے

"یار۔ میں پوری طرح سُجاگ ہوں۔ تم کہہ رہے تھے کہ قانون کی زنجیر گلے آپڑی۔ اور تُم نے ہیم سے مدد طلب کر لی"

"ہاں یار۔ وہ تو مان گئی۔ کہنے لگی شادی کر لیتے ہیں۔ تم جانو دُنیا کی کوئی گورنمنٹ میاں بیوی کو الگ نہیں رکھ سکتی۔ ویسے محبت بھی اس کی کچی تھی۔ خود میری اپنی محبت کی طرح۔ وہ تو ساتھ کھڑی ہوگئی مگر ابا میاں دُور ہٹ گئے۔ ایک دن اُن کا فون آیا۔ ہاں اب اُن کے فون بھی آنے لگے تھے۔ وہ اس طرح کہ میں نے امی سے کہا تھا کہ (COLLECT CALL) کے ذریعے مجھ سے کبھی کبھی بات کرلیا کرے۔ ادائیگی ادھر سے میں کردیا کردوں گا۔ ابا کو جب اس راستے کا علم ہوا تو اکثر اُن کے فون آنے لگے۔ وہ دراصل انہوں نے میرے پونڈوں کے خیالی درشن کرلئے تھے۔ اس لئے میں اُن کو اب بہت پیارا لگنے لگا تھا۔ تو ایک دن اُن کا فون آیا۔ "پُتر اب تو گھر آجا"۔ مگر پھر وہ سنبھلے شاید غلط کہہ گئے تھے اپنی غلطی دُرست کی اور کہا۔ "چاہے چند ہفتوں کے لئے ہی سہی۔ تیرے لئے دِل بہت اُداس ہے"۔

"آپ کی اُداسی کی قیمت کیا ہے؟" میں نے پہلے ہی کی طرح سوال کیا۔ کیونکہ پہلے بھی میرے چند سو روپوں کا چیک اُن کی اُداسی دُور کر دیتا تھا۔

اِس بار وہ بولے۔ "میں تُم سے بولنا بند کر دوں گا۔ اگر تم ایسی باتیں کرو گے تو"۔

رُوٹھتے وہ بات بات پر تھے۔ حتیٰ کہ میں دوستوں سے اُدھار لے کر جب باہر نکلا تھا تب بھی وہ رُوٹھ بیٹھے تھے اور مجھے ائیرپورٹ پر سی آف تک کرنے نہیں آئے تھے۔ یہ کیسے باپ تھے کہ بیٹا سات سمندر پار جا رہا تھا۔ سات پانیوں سے پار اُترنے سے پہلے کسی بھی ہوائی حادثے میں، دریائے زندگی سے بھی پار اُتر سکتا تھا۔ مگر وہ رُوٹھے بیٹھے تھے۔ اُنہیں شک تھا کہ میں اُن سے اپنی تنخواہ کے پیسے چُھپا کر رکھتا رہا تھا۔ جواب میں باہر جانے کے لئے استعمال کر رہا تھا۔

"آں ہاں۔ ایسا مت کرنا ڈیڈی"۔ انگلینڈ رہنے کے بعد اب میں اُنہیں ڈیڈی ہی کہنے لگا تھا۔ اس میں دوستانہ سی قُربت محسوس ہوتی تھی۔ یہی لفظ اگر میں وہاں استعمال کرتا تو وہ مارتے مارتے میرا بُھرکس نکال دیتے مگر اب برداشت کر لیتے تھے۔ "آپ رشتہ داروں کے شادی بیاہ حتیٰ کہ غمی تک میں بھی رُوٹھتے رہے ہیں۔"

"مگر اب تمہاری شادی پر نہیں رُوٹھوں گا" وہ کہہ رہے تھے۔

"سچ ڈیڈی"

"بالکل۔ لڑکی میں نے دیکھ لی ہے۔ بہت خوبصورت ہے۔ باپ بہت مالدار ہے۔ لاکھوں میں کھیلتا ہے۔ جہیز بھی بہت ملے گا"۔

"اوہ تو یہ خوبصورتی ہے اس کی مگر ڈیڈی لڑکی کی خوبصورتی تو میری آنکھوں سے دیکھی جائے گی۔ اور لڑکی میں نے دیکھ لی ہے۔ آپ کو دکھا تو نہیں سکتا۔ آواز سُنا سکتا ہوں میرے پاس بیٹھی ہے"۔

"کون ہے؟ ان کی آواز بیٹھ سی گئی۔ جیسے اس اطلاع نے اُن کے گلے پر دس کلو وزن کا بٹہ رکھ دیا ہو۔ تھوڑی

دیر بعد وہ سنبھلے اور بولے: "کسی گوری کلموہی کے چکر میں تو نہیں پھنس گئے۔ مجھے تمہارے یہ لچھن بالکل پسند نہیں۔"

"آپ پھر رُوٹھ گئے۔ کاش ڈیڈی آپ اپنی شادی پر رُوٹھ جاتے تو ہماری ماں کے ساتھ ساتھ ہمارا اور کئی دوسرے رشتہ داروں کا بھی بھلا ہو جاتا۔"

انھوں نے میری بات کا ذرا بھی بُرا نہیں مانا۔ بولے: "کچھ تھوڑا سا دے دلا کر جان چھڑا لو۔ انگریز لڑکیاں تو ایک وہسکی کی بوتل پر بھی راضی ہو جاتی ہیں۔"

مجھے پھر مذاق سوجھا۔ وہ بھی تو بڑی بے دردی سے میری محبت کا مذاق اُڑا رہے تھے۔ "آپ کو اس بات کا کیسے تجربہ ہے؟" اُدھر سے کچھ دیر کے لئے خاموشی رہی تو میں نے کہا: "ابا جان۔ آپ کون سی دنیا میں رہتے ہیں۔ اب ہم مشرقی لوگوں نے ان کاموں کے لئے انھیں ہزاروں پونڈ اور ڈالر دکھا دیئے ہیں۔ پورا بزنس ہوتا ہے۔ آپ کہیئے گا بزنس۔ لڑکی روپوں پر بھی راضی ہو جائے گی۔ کتنے دے سکیں گے؟ سودا مہنگا نہیں پڑے گا۔ چند ہزار پر راضی کر لوں گا۔ اُدھر میرا رشتہ تو آپ لاکھوں کی جگہ پر کرنے جا رہے ہیں۔ چند ہزار کا نقصان برداشت کر لیجئے گا نا؟" شاید آج وہ اپنی ہی غرض کے تحت میری سب گستاخیاں برداشت کرنے پر تلے تھے۔ اُدھر سے خاموشی رہی تو میں نے سوچا۔ آج ایک اور سچائی بھی اُگل دوں۔

میں نے کہا: "ڈیڈی ہم مسلمان یہاں آ کر پورے بنیئے بن گئے ہیں۔ بزنس مین، جس کو دیکھو ایک ایک پونڈ دانت سے پکڑتا ہے۔ وہ مسلمان جو توکل بر خدا یعنی آج کھا کل خدا پر یقین رکھتا تھا اور بے فکری سے تنگڑا ہوتا جاتا تھا۔ اب کھا کھا کر سوکھتا جاتا ہے۔ میں نے تو گھر میں ہی آپ کو ایک ایک پیسے کے پیچھے بھاگتے دیکھا ہے۔ اس لئے مجھے آپ سے ایک الگ راہ چننی تھی۔ ڈیڈی کان کھول کر سن لو۔ یہ لڑکی ایسی نہیں اور ہم دونوں بزنس نہیں محبت کرتے ہیں۔"

"بیٹا۔ یہ میں بول رہی ہوں۔ تیرے ابا جو چاہتے ہیں وہی میں چاہتی ہوں کہ..... " میری ماں کی آواز تھی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ ابا جان نے جانے کون سا جھرلو امی جان پر پھیر دیا ہے کہ کسی اور کی سنتی ہی نہیں۔ ان ہی کی سُر میں سُر ملائے جاتی ہیں۔ میری طرف سے ہاں ہوں نہ سن کر وہ بولیں۔ "کہاں ہو؟ سُن رہے ہو کہ نہیں؟"

میں نے کہا: "جھرلو..... " پھر سنبھلا اور بولا۔ "سن رہا ہوں امی تم بولتی جاؤ۔"

"وہ کونسا جھرلو پھیر دیا ہے تم پر گوری چمڑی والی نے؟" انھیں میرے ہی لفظ جھرلو سے بات بڑھانے کا موقع مل گیا۔

میں نے کہنا چاہا: "وہی جس نے ابا کے دوزخ سے اتنے سالوں بعد بھی تمہیں آزاد نہیں ہونے دیا۔" مگر میں ماں کو ایسا نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک وہی تو میری سچی ہمدرد تھیں میں جانتا تھا، ابا ہی کے یہ الفاظ اُن کے منہ سے ادا ہو رہے تھے مگر میں نے اس وقت ہتھیار ڈالنے مناسب نہ سمجھے۔ انھیں بتا ہی دیا کہ "نینسی حاملہ ہے اور اب اس حالت میں میں اُسے نہیں چھوڑ سکتا۔"

پھر ابا نے امی سے فون لے لیا۔ بولے۔ "تم اُسے چھوڑ کر فوراً یہاں آ جاؤ۔"

"اور ممی ڈاکٹر نے ابھی سے بتا دیا ہے کہ دو جڑواں بچے ہیں اور دونوں لڑکے۔" میں نے جان بوجھ کر باپ کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا: "بس تین مہینے اور انتظار کر لو ممی۔ آپ کے دونوں پوتوں کو بھی ساتھ لاؤں گا۔"

"میں کیا کہہ رہا ہوں، سنا نہیں تم نے؟" ابا بیچ میں بول پڑے۔

"اور ہاں امی۔ نینسی اسلام بھی قبول کرنے کو تیار ہے۔"

میں جانتا ہوں۔ ابا کے لئے یہ بھی کوئی بہت بڑی کشش نہیں تھی۔ دوسرا ہتھیار میرے پاس یہ تھا کہ پوتے پوتیاں دادا دادی کی کمزوریاں ہوتے ہیں۔ بچہ تو خیر بعد میں ایک ہی ہوگا۔ دوسرا لوکا بھائی کشش کی طرح پیدا کر لیا جائے گا، ماں کی گود میں اپنا جعفر، ہاں نینسی اور میں نے اس کا یہی نام سوچ رکھا ہے۔ اور باپ کی گود میں دس ہزار پونڈ کا ڈرافٹ ڈال دونگا تو اُن کا سب اُبال سوڈے کی جھاگ کی طرح اپنے آپ اپنے ہی اندر بیٹھ جائے گا۔"

ساتھ ہی کل مجھے عائشہ کا خط ملا۔ ساتھ فوٹو بھی بھیجا تھا۔ شاید تقدیر خود ہی ہم لوگوں کو ملانے کا بندوبست کر رہی ہے یہ میں ہی ہوں جس سے تمہارے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ اب تم جلدی سے آجاؤ تو ہم ایک دوسرے سے ہو جائیں۔

"ارے کہانی تو اب بن رہی ہے۔" میں اچھل پڑا۔

"نہیں چودھری صاحب۔ کہانی بگڑ گئی ہے۔ میں نے اُسے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ میں اُس کی سب شرطیں پوری کرنے کو تیار ہوں مگر مجھے دس سال پُرانی عائشہ نہیں چاہیئے۔ مجھے میری وہی نئی عائشہ لا دو۔ یہ کہاں کا انصاف ہوا کہ قیمت اپنی مرضی کی مانگ کر چیز پُرانی ٹکرا دو۔"

"ادھر نینسی بھی تو حاملہ تھی،" میں نے کہا۔

"اجی کہاں۔ آپ کو تو علم ہے۔ یہاں میاں بیوی بچہ پیدا کرنے سے پہلے اپنی اور بچے کی ساری زندگی پلین کر لیتے ہیں۔"

"ایسا ہر ایک کے ساتھ تو نہیں ہوتا۔ میں نے ایسی عورتیں بھی یہاں دیکھی ہیں کہ بچہ حاصل کیا اور مرد کو دھتا بتا دیا۔"

"ٹھیک ہے مگر بہت سی گھر گرہستی کی بھی خواہش مند ہوتی ہیں۔"

"اب کیا ارادے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے شیلف سے ایک گول گیند سا پتھر اُٹھا کر مجھے دکھایا۔ بولا۔ "یہ پتھر جانے کہاں پہاڑوں لڑھکتا، ندیوں بہتا، رگڑیں کھاتا، شکلیں بدلتا۔ گول گیند بن کر مجھ تک پہنچا ہے۔ یہی میرا گورو ہے۔ اسی لئے شیلف پر سجا رکھا ہے۔"

سچ جیسے سپنے

پہلے پہل جب جوانی نے میرے ذہن کے کواڑ کھٹکھٹانے شروع کئے تو مجھے بڑے ہی مٹکنی کلر خواب آنے لگے۔ یہ خواب میں نے دن کو بھی دیکھا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ایسے رنگ برنگے ستارے ناچتے، ایسے نقش و نگار بنتے، ایسے ایسے چاند سورج چمکتے، ایسے ایسے کٹ گلاس لشکارے مارتے، جو ابھی تک طلوع نہیں ہوئے، ایجاد نہیں ہوئے۔ پھر اُن بے مثال رنگوں، ڈیزائنوں اور خوبصورتیوں میں ایک ایسا نسوانی چہرہ اُبھرتا کہ جس کی خوبصورتی کے آگے ساتوں جہانوں کا حُسن پھیکا پڑ جاتا۔

اب میں ساٹھ سال سے دو سال اوپر گذار چکا ہوں۔ اُن خوابوں کو میں جوانی مستانی کے سپنے کہہ کر گذر جاتا مگر اب بھی جب میں رات گہری نیند کی وادیوں میں گم ہوتا ہوں یا دن کے بھرے پُرے اُجالے میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو وہی رنگ، وہی نقش و نگار، وہی رنگ برنگے چاند سورج اور وہی دلآویز کٹ گلاس آنکھوں کو خیرہ کرنے لگتے ہیں۔

میں نے بہت دُنیا دیکھی ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر حسین اور دلکش چہرے دیکھے ہیں مگر میرے سپنوں والا وہ چہرہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔ اور میں نے دل کو سمجھا لیا ہے کہ خواب آگیں مناظر میں گھرا وہ خوبصورت چہرہ شاید قدرت سے تخلیق ہی نہیں ہو سکا ہے۔

اپنے دیس میں جس زمانے میں میں نے جوانی کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھا تھا، تب عورت ایک ڈھکی چھپی حقیقت ہوتی تھی جو پردۂ مجاز سے ایک پل جھلک دکھاتی تھی اور دوسرے پل غائب ہو جاتی تھی اس لئے اُس دور کا نوجوان اپنے خوابوں کی تعبیر فلمیں دیکھ دیکھ کر فلم ایکٹرسوں کے چہروں میں تلاش کر لیا کرتا تھا اور میرا خیال ہے کہ اُس وقت کی فلم ایکٹریسیں ہوتی ہی حسین تھیں کیونکہ اُس زمانے میں انہیں ایکٹنگ سے زیادہ اپنے حسنِ جہاں سوز سے دِلوں کو لُبھانا ہوتا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔ اگر میں آج کا جوان ہوتا تو شاید مجھے آج ہی کی ہیروئنیں حسین اور دلکش لگتیں۔ بہرحال اپنے خوابوں کی شہزادی سے کچھ کچھ ملتا جلتا چہرہ میں نے بھی پردۂ سکرین پر ہی ڈھونڈ لیا۔ اُس کا نام نینا تھا۔ ہاں وہی فلمی ہیروئین جسے اُس زمانے میں پُراسرار نینا کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ نینا مجھ سے اُتنی ہی دور تھی جتنا مجھ غریب سے بمبئی کے ٹکٹ کے پیسے ہو سکتے تھے اور اتنی ہی نزدیک جتنے سینما کے ٹکٹ گھر تک پہنچنے کے پیسے۔ پیسے جتنے کم ہوتے، نزدیکی اُتنی زیادہ ہوتی کیونکہ سستا ٹکٹ پردۂ سکرین

rekhta

کے بہت قریب بٹھاتا تھا۔

پھر میری شادی ہوگئی۔ محلہ والے، دوست، رشتہ دار سب کہتے کہ میرے گھر کے آنگن میں کوئی اِندر کے اکھاڑے کی اپسرا اُتر آئی ہے اس میں کوئی شک نہیں تھا مگر پھر بھی وہ ویسی نہیں تھی جو میرے خوابوں میں آتی تھی اور نہ ہی اُس کی مسکراہٹ نینا کی مدھر مُسکان سے کہیں بھی میل کھاتی تھی۔ پھر میرے گھر ایک بچی نے جنم لیا۔ وہ ماں سے کئی گنا زیادہ سُندر تھی مگر۔۔۔۔۔۔ اور میں نے اُس کا نام نینا رکھ دیا۔

خواب نظر آتے رہے۔ تلاش جاری رہی، آنکھیں جستجو میں رہیں۔ یہی تلاش کبھی کبھی مجھے میری بیوی سے دُور کہیں اِدھر اُدھر بھٹکنے کو لے جاتی اور میں ایک ویرانے میں پہنچ جاتا۔ اگر آپ دہلی کا جغرافیہ تھوڑا بہت جانتے ہیں تو آپ نے دھولا کنواں کا نام ضرور سُنا ہوگا۔ اس گول چکر سے پانچ اطراف کو سڑکیں پھوٹتی ہیں، جو سڑک تری مُورتی کو جاتی ہے اُس پر چلنے تو آپ کے دائیں ہاتھ بہت سی کوٹھیاں اور کالونیاں نظر آئیں گی اور بائیں طرف گھنا جنگل۔ یہ میں پندرہ بیس سال پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ دُور اندر کئی پگڈنڈیاں گھومنے کے بعد اُسی جنگل میں ایک عمارت آتی تھی۔ ویران بھی اور آباد بھی۔ ویران اِس طرح کہ پُرانی اکیلی اور دُور اُس گھنے جنگل میں سُنسان جگہ پر واقع تھی اور آباد اس طرح کہ اس کے مختلف حصے مختلف فن کاروں کو الاٹ کئے گئے تھے جو وہاں سنگ تراشی پینٹنگ یا بُت سازی کا کام کرتے تھے۔ وہیں ایک بار، جب سب فن کار ابھی نہیں آئے تھے، چوکیدار نے مجھے عمارت کو اندر سے دیکھنے کی اجازت دے دی تھی شاید اُسے میرے چہرے میں بھی کسی فن کار کے نقوش نظر آ گئے تھے۔ میں نے وہاں مختلف ہالوں میں فن کاری کے مختلف نمونے دیکھے تھے۔ چوکیدار مجھے ایک اور ہال بھی دکھانا چاہتا تھا جس کی چابی لانے اُسے دُور اپنے کوارٹر پر جانا پڑ گیا تھا۔ اور میں اُس وقفے میں اندر بچھی چارپائی پر پل بھر کو دم لینے کو لیٹا ہی تھا کہ مجھے نیند نے دبوچ لیا۔

میرا ہاتھ تھامے، میرے آگے آگے چلتی ہوئی مجھے تقریباً کھینچتی ہوئی وہ مجھے پگڈنڈیوں، جھاڑیوں اور دشوار گذار راستوں سے نکالتی، بہت دُور اندر گھنے جنگل میں لے گئی۔ پھر اُس نے پر تولے اُڑان بھری اور مجھے ساتھ لئے ایک محل کی چھت پر اُتر گئی۔ چھت کسی سمندری جہاز کے بالائی ڈیک کی طرح چوڑی اور ہموار تھی اور آس پاس دُور دُور تک لامتناہی جنگلات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ اُوپر آسمان کا بے پایاں نیلا سمندر ہمارے سروں پر اُلٹا ٹنگا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ڈوب جانے کے ڈر کی ایک لہر میرے دِل میں اِس سے اُس کونے تک دوڑ گئی۔ چھت کے مغربی کونے میں ایک سوراخ تھا۔ وہ میری کمر پہ ہاتھ رکھے مجھے اس گہرے کھائی نُما سوراخ میں اُتارے گئی تھی۔ اُوپر سمندر، نیچے کھائی، دوسری طرف اس کا خوبصورت سراپا۔ میں اُس کے ساتھ چلتا گیا۔ کھائی دراصل نیچے جانے کا زینہ تھا، جس پر اُسکے اپنے حُسن سے پھُوٹتی شعاعوں نے رُوشنیاں بکھیر دی تھیں۔ اُسکے بال لمبے، کالے اور گھنے تھے۔ پاؤں سفید کبُوتروں کا جوڑا، جن کے گلوں میں ننھے ننھے گھنگھرو جھنجھنا رہے تھے۔ کالی ساڑھی اور کالے ہی بلاؤز میں اُس کا گورا گورا جسم چُولھے پر رکھے دُودھ کی طرح اُبل اُبل کر باہر آ رہا تھا۔ اُس کے کولھوں کی اُٹھتی بیٹھتی حرکتوں میں ایک رقص کی سی کیفیت تھی۔

ہم ایک بڑے ہال میں داخل ہوئے تھے جو جا بجا خوبصورت تصویروں، میزوں کرسیوں، مُورتیوں اور مُورتی کار

کے سازوسامان اور اُلم غلم اشیاء سے اَٹا پڑا تھا۔ کسی فن کار کا سٹوڈیو میرے لئے ہمیشہ ایک سنسنی انگیز جگہ رہی ہے۔ وہ میرے سامنے صوفہ پر نیم دراز سی ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ مغربی حُسن کا بہترین شاہکار، مشرقی لباس اور زیورات میں وہ کسی کلاکار کی تراشیدہ، مورتی لگ رہی تھی۔ شاعر کے تخیل سے بھی زیادہ حسین اور توبہ شکن۔

"کہاں چلے گئے تھے پردیسی؟"

سامنے کسی بہت بڑے لیڈر کی طویل و عریض وزنی مُورتی ہمیں بُری طرح گھور رہی تھی۔ وہ اِس قدر ہمارے اُوپر جھک آئی تھی جیسے ہمارے اُوپر گر پڑے گی۔ حسینہ نے اپنی بانہوں کے ہار میری گردن میں حمائل کر دئے۔ اُس کے ہونٹ کسی پھول کی پتیوں کی طرح ہوا کے دوش پر پھڑپھڑاتے کسی محبت بھرے گانے کے بول کا ٹکڑا گنگنا رہے تھے۔ اُدھر مُورتی کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگی تھی اور وہ گر پڑنے کے انداز میں ہم پر بے انتہا حدوں تک جھک آئی۔ تبھی میرے گلے سے ایک چیخ نکل گئی۔

"بابوجی۔ کیا ہُوا؟" چوکیدار مجھ پر جُھکا، مجھ سے سوال کر رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔ ایک ڈراؤنا خواب تھا۔" چہرے سے پسینہ پونچھتے اور آنکھیں ملتے ہوئے میں نے جواب دیا۔

وہ میرے لئے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لے آیا۔

"چلیئے۔ آپکو اگلا ہال بھی دِکھادوں۔" اُس نے انگلی پر چابی گھماتے ہوئے کہا۔

حیرت سے میری آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ وہی ہال تھا، وہی سازوسامان، وہی مُورتیاں، میزیں، کُرسیاں اور وہی قہر آلود آنکھوں سے گھورتی ایک شہسوار کی مورتی۔ چوکیدار ایک گائیڈ کی طرح بہت کچھ بتا رہا تھا مگر میں غیر حاضر تھا۔ سارے ہال کا چکر لگانے کے بعد میں اُسی دیوان پر آ بیٹھا تھا، جہاں کچھ دیر پہلے اپنی خوابوں کی پری کے ساتھ براجمان رہا تھا۔ اچانک میری نظریں ایک کونے کی طرف اُٹھ گئی تھیں۔ وہاں سے ایک زینہ چھت کی طرف جا رہا تھا جس کی سیڑھیوں پر قدم بہ قدم سورج کی دُھوپ اندر اُتر رہی تھی۔ میں زینے سے اُوپر کُھلی چھت پر پہنچ گیا۔ چھت کسی سمندری جہاز کے بالائی ڈیک کی طرح چوڑی اور ہموار تھی۔ دُور دُور جنگلوں کے بیکراں سلسلے تھے اور اُدھر نیلا اٹلانٹک کنارِ سمندر۔

"صاحب۔ میم صاحب ٹھیک ہیں؟"

"کون میم صاحب؟" میں نے حیران ہو کر پُوچھا۔

چوکیدار نے مجھ سے زیادہ حیرت سے میری آنکھوں میں جھانکا، "وہی جن کے ساتھ آپ پچھلے سال یہاں آئے تھے۔ بعد میں آپ نے شادی بھی کر لی تھی۔"

"تم کس کی بات کر رہے ہو؟" میں مجسم حیرت و استعجاب بنا سوال کر رہا تھا۔

"صاحب ــــ وہ ہمیں شادی کی مٹھائی بھی دے گئی تھیں۔ بتایا تھا کہ وہ آپکو ساتھ لے کر کہیں باہر جا رہی ہیں۔"

اُس شام بھی میری آنکھوں میں انتظار کے دِیوں نے میری بیوی کو پھر ناراض کر کے خود میرا بھی موڈ خراب کر دیا تھا۔

۱۹۷۱ء میں شاید یہی انتظار میری اکیس[۲] سالہ پکی گورنمنٹ سروس کو لات مروا کر مجھے جرمنی لے گیا مگر جرمنی مجھے خوبصورت

نظاروں سے کم، کلوں اور مشینوں سے بھرا شہر زیادہ محسوس ہوا اور میں قدرتی حسن کی تلاش میں آگے بڑھ گیا۔ میرا اگلا قیام ناروے تھا۔

اوسلو ناروے کا دارالخلافہ ہے اور ناروے والوں کے لئے ایک بہت بڑا، بہت معروف اور پُرہجوم شہر، لیکن آپ اگر دہلی جیسے شہر سے یہاں آئے ہوں تو یہ آپکو ایک چھوٹا سا خوبصورت پہاڑی قصبہ لگے گا۔ اب ۱۹۸۹ء میں اوسلو نے دیکھتے ہی دیکھتے اِدھر اُدھر کافی پاؤں پسار لئے ہیں مگر ۱۹۷۰ء میں جب میں یہاں آیا تو یہ بہت ہی مختصر سا پرانی دہلی جیسا شہر تھا جیسے وہاں ایک زمانے میں دہلی گیٹ، کشمیری گیٹ اور موری گیٹ وغیرہ سے باہر نکلنے پر آپ شہر کی حدود سے باہر آجاتے تھے۔ ویسے ہی تب کار پر اوسلو کے اِردگرد آدھے گھنٹے میں چکر لگ جاتا تھا اور دس منٹ کسی بھی طرف ڈرائیو کرکے نکل جاتے تو آپ پیڑوں، پہاڑوں اور پانیوں کی قدرتی خوبصورتیوں میں پہنچ جاتے تھے۔ اَب ان نظاروں تک پہونچنے کا وقفہ زیادہ سے زیادہ پچیس ۲۵ تیس ۳۰ منٹ کی ڈرائیو رہ گیا ہے۔

۱۹۷۶ء میں میری بیوی اور بچے بھی میرے پاس ناروے آگئے۔ میں باہر بھی رہا۔ گھر بدلتا، نوکریاں کرتا، بچوں کی شادیوں کی فکروں سے سبکدوش ہوتا اور اندر بھی رہتا رہا، اپنی کہانیوں اور انتظاروں کی دُنیا میں کھویا کھویا سا، ڈوباڈوبا سا۔ اور وقت اپنے تیز رفتار پَروں سے اُڑتا ہمارے سروں سے گذرتا گیا۔ پھر میرے بیٹے کی ایک نارویجیئن لڑکی سے شادی ہوئی اور اُس نے بیرومِ ورک کی خوبصورت کاؤنٹی میں پائن درختوں سے گھرا اور دلنشین نظاروں سے گھری پہاڑی پر ایک خوبصورت تین منزلہ گھر بنایا۔ ہوتے ہوتے دادا بننے کی خوشی بھی ملی۔

میری ڈھلتی عمر کے باوجود خواب مجھے رنگین ہی نظر آتے رہے مگر میں اُنہیں نظر انداز کرتا رہا کہ اب میرا زمانہ لد چکا تھا۔ ہاں ایک بار لاہور کے ایک دوست سے فِلم ایکٹرس نینا کا ذکر کیا تو وہ اُسکے میاں ڈبلیو۔ زیڈ احمد کا اسسٹنٹ نِکلا، جو اب ناروے میں بس گیا تھا۔ اُس نے مجھے نینا کا لاہور کا ایڈریس مہیا کردیا اور بتایا کہ وہ اب اپنے کسی بھی مداح سے بڑے اشتیاق سے مِلتی ہے۔

۱۹۸۲ء میں میرا لاہور جانا ہوا تو دِل میں نینا سے مِلنے کی خواہش بیدار ہوئی مگر دماغ نے اُس دِلی خواہش کو یہ کہہ کر رد کر دیا۔ کہ وقت کے پنجے اچھے اچھے چہروں پر کمرونچیں ڈال دیتے ہیں۔ وہ تمہارے تخیلات کی دُنیا میں نوجوان اور خوبصورت ہے۔ اُسے ویسے ہی رہنے دو۔ ذہن کی جھیل میں بسے اُس خوبصورت عکس کو ملاقات کا پتھر پھینک کر خراب نہ کرو۔" اور میں نے اُس سے مِلنے کا اِرادہ ترک دیا۔

میرا بیٹا اور بہو دور شمالی ناروے کے قصبہ ایونیس میں اپنی دو ماہ کی ننھی منّی بچی "بیسری" کو اُس کے نانا نانی سے ملوانا چاہتے تھے اور گھر پر اُنہوں نے لیسا (LISA) پال رکھی تھی۔ انہوں نے ایک ہفتہ کے لئے لیسا کی دیکھ بھال میرے ذمّہ لگائی اور ایونیس کے لئے پرواز کر گئے۔

لیسا کی دیکھ بھال میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ خود اُس کا اپنا رویہ بھی بڑا پُر تعاون اور دوستانہ تھا۔ صبح اُس کے کھانے کے ڈبے سے اُسکی ایک کٹوری بھرنا، دوسری کٹوری میں پانی بھرنا، دفتر جانے سے پہلے اُسے گھر سے باہر نکال دینا، واپس

آکر اُسے آواز دے کر بُلانا، کھانا کھلانا، یہی ساری اُسکی دیکھ بھال میرا فرض تھا۔

اپنے بیٹے کے گھر میں وہ میری چوتھی رات تھی کہ وہ پھر ایک مدّت بعد میرے خوابوں میں در آئی: "میں نے ایسے ہی گھر کی تم سے تمنّا کی تھی، جو ایسے ہی پُرکیف نظاروں سے گھرا ہو جسکی کھڑکیوں سے دِن کو سُورج اور رات کو چاند ستارے اندر جھانکتے ہوں۔ تم سے تو تمہارا بیٹا ہی اچھا ہے جس نے اپنی بیوی کے لئے ایسا دلکش گھر بنایا ہے۔" وہ شکایت کرتی ہوئی بڑی تیزی سے گورے گورے پاؤں میں چاندی کی پازیبیں چھنکاتی سیڑھیاں اُترتی میری طرف آ رہی تھی اور میں بڑے پیار سے اُسے تنبیہ کر رہا تھا۔ "مینا۔ آہستہ آہستہ۔ آہستہ۔ گر پڑو گی"۔ اور یکایک میری آنکھ کھل گئی۔ یہ ایسا تھی جس نے ننھے منے گھنگھروؤں والے گیند کو سیڑھیوں سے لڑھکا دیا تھا اور اب وہ میرے بستر کے قریب بیٹھی بڑی پیاری نظروں سے مجھے نہارتی میاؤں میاؤں کئے جا رہی تھی۔

بہو اور بیٹے کے واپس آنے سے دو دِن پہلے کسی نے میرے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا سامنے دو نوجوان نارویجئین میاں بیوی کھڑے تھے۔ انہوں نے ساتھ والے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "ہم آپکے بیٹے کے پڑوسی ہیں۔ وہ ہمیں کہہ گئے تھے کہ آپ پارٹ پیشنٹ ہیں اور ہم آپ کا خیال رکھیں۔ معاف کیجیئے ہم دوسری مصروفیات کی وجہ سے پہلے نہ آ سکے۔ کیا آپ آج شام ہمارے ساتھ چائے پینا پسند فرمائیں گے؟

نارویجئین لوگ اوّل تو آپکا نوٹس ہی نہیں لیتے مگر کسی کو اگر چاہنے لگتے ہیں تو اُن کی چاہت میں خلوص ہوتا ہے۔

ارے یہ تو بالکل ویسا ہی ڈرائنگ رُوم ہے جیسا میں نے دہلی کے ویرانے میں دیکھا تھا۔ وہی سجاوٹ، ویسا ہی ساز و سامان اور ویسی ہی چنگاریاں برساتی آنکھوں والی ایک شہسوار کی مورتی کی طویل و عریض فریم شدہ تصویر۔ اور شیلف پر ایک فریم میں سٹینڈ پر کھڑی ہوئی ایک نوجوان عورت کی تصویر، جیسے میرے تخیلات کی رانی کھڑکی جیسے فریم میں میری منتظر بیٹھ گئی ہو۔ میں کھویا کھویا سا کافی دیر تصویر کے سامنے کھڑا رہا۔

ناروے میں کسی عورت کو حسین کہنا، اُس کی تعریف اور عزّت افزائی کی علامت ہے۔ چاہے وہ کسی کی ماں، بہن یا بیٹی ہی کیوں نہ ہو اور آپ اُس کے حُسن کی تعریف اُنکے سامنے کر رہے ہوں۔ تو بھی کوئی بُرا نہیں مانتا بلکہ خوش ہی ہوتا ہے۔ میرے مُنہ سے بے اختیار نکلا۔ "خوبصورت، بہت ہی خوبصورت"

"ملنا چاہیں گے آپ اِن سے" میرا میزبان بولا۔ "پہلے کھانا پینا یا ملاقات؟" نارویجئین کھانوں سے بھری ہوئی ڈائننگ ٹیبل کی طرف دیکھتے ہوئے اُس نے دوسرا سوال کیا۔ اُس کے لب پُراسرار انداز میں مُسکرا رہے تھے۔

"انہیں بھی بُلا لیجیئے۔ چائے کا مزہ دوبالا ہو جائے گا"۔ میں نے درخواست کی۔

"آپ تشریف رکھیئے۔ ابھی بُلواتا ہوں"۔ اب وہ باقاعدہ ہنس رہا تھا۔ اُس نے بیوی سے کہا۔ "ذرا مینا کو لے آیئے"۔ میں پل بھر کو چونکا پھر خیال آیا کہ ناروے میں عورتوں کا مینا نام بہت عام ہے اور یہاں بزرگوں کو ان کے نام سے پُکارنے کا چلن بھی عام ہے۔

اِتنے میں اُس کی بیوی نے اندر سے ایک ادھیڑ عمر عورت کی فریم کی ہوئی تصویر لا کر میرے سامنے میز پر رکھ دی۔ اُسکے

ساتھ ہی اُس نوجوان کے چہرے پر ذرا سی اُداسی کی لکیر اُتر آئی ۔ "ممی دو سال پہلے گذری ہیں۔ جوانی میں بہت خوبصورت تھیں۔ نہ صرف ناروے بلکہ سارے یورپ میں اُنکے حسن کا چرچا تھا۔ اب ساٹھ سال کی عمر میں بھی اُن کے چہرے پر نور برستا تھا۔ ذہن بڑا فن کارانہ تھا۔ مرنے سے چھ ماہ پہلے ہمارے ہاں آکر ٹھہری تھیں۔ آپ کے بیٹے کا مکان اُنہیں بہت پسند تھا۔ ہر وقت اُدھر ہی نظریں جمائے رکھتی تھیں"

"کیا ہوا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ شاید مرنا چاہتی تھیں۔ مر گئیں کوئی کچھ نہ سمجھ سکا"

ٹمپل روڈ

ہم اُس کالونی کی مندر والی گلی میں رہتے تھے، جہاں سناتن دھرم مندر، آریہ سماج مندر اور گوردوارہ ساتھ ساتھ تھے۔ پجاری لوگ صبح چار بجے سے لاؤڈ سپیکر پر پوجا اور کیرتن وغیرہ میں جُٹ جاتے تھے۔ گھڑیال، سنکھ، ڈھولک، باجہ، چمٹے بجتے اور اُونچی اُونچی آوازوں میں اُوپر والے کو نیچے بلایا جاتا۔ اُوپر والا تو اُن دکانوں پر بکنے نیچے آتا یا نہیں مگر نو بجتے بجتے پجاریوں کے سامنے بے شمار سکّوں کے ڈھیر ضرور لگ جاتے۔ شور وغل کا یہ سلسلہ شام کو بھی شروع ہو جاتا جیسے دنگلوں میں اُترنے والے پہلوان اپنے اپنے ڈھول زور زور سے بجواتے ہیں۔

میرا پڑھا لکھا باپ کئی دفعہ جا جا کر اُن سے شکایت کر چکا تھا کہ ہمیں بھی چین سے سونے کا حق دیا جائے۔ پہلے تو وہ اس کی شخصیت، عہدے، شرافت اور اپنی دُکانیں نئی ہونے کی وجہ سے اُس سے نرمی سے پیش آتے رہے مگر جوں جوں اُنکے جمانوں اور بھگتوں کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، اُنھوں نے اپنے کانوں پر جُوں تک بھی رینگوانی بند کر دی اور پھر تو باقاعدہ اُسے دھتکارنے بھی لگے کہ اُسے بھگوان نام سے چڑ ہے اور وہ ناستک ہے۔

پڑھے لکھے ماں باپ کا بیٹا، میں نہ صبح آرام سے پڑھ سکتا اور نہ رات ہی سکول کا کام کر سکتا۔ مندروں کے آس پاس والے گھروں کی قیمتیں بھی اسقدر گِر گئی تھیں کہ میرے باپ کے لیئے اپنا گھر بیچ کر کہیں دوسرا مکان خریدنا ایک مسئلہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں بار بار فیل ہونے لگا۔

دسویں میں تین بار فیل ہونے کے بعد، میں نے سکولوں کے چکر لگانے بند کر دیئے اور ایک پلمبر سے کام سیکھنے بیٹھ گیا۔ کالونی نئی نئی بس رہی تھی۔ کام بہت تھا۔ چند مہینوں میں ہی میں خود بھی پلمبر بن گیا اور اپنے ہی اُستاد کے سامنے اُن ہی کی کالونی میں اُن ہی جیسا کام کرنے لگا۔ پہلے پہل مجھے شرم تو بہت محسوس ہوتی تھی اور لگتا تھا جیسے میں اپنے ہی گورو کے کام میں چوری کر رہا ہوں مگر اُنہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں تھی کیونکہ نئی نئی کالونی میں خود اُن کے پاس کام اِس قدر زیادہ تھا کہ سنبھالے نہ سنبھلتا تھا۔

یہ اُستاد کی راہ سے ہٹ جانے کی خواہش تھی یا بہانہ کہ چند پیسے جمع ہو جانے کے بعد میں کہیں خارن جانے کے

rekhta

بارے میں سوچنے لگا۔ جیب میں چار پیسے بھی جمع ہو چکے تھے اور میرے جیسے کاریگر کی باہر قدر بھی بہت تھی۔ ایجنٹ لوگ موٹی سی رقم لے کر ٹکٹ، جہاز، پاسپورٹ سب کا بندوبست کر دیتے تھے اور سیدھے ہزاروں کے بدلے لاکھوں کے کام کی جگہ پر جا بٹھاتے تھے۔ چنانچہ ایک دن میں بھی فارن پہنچ گیا۔ اپنے ہاں اُوپر والے سے میری کبھی دوستی نہیں رہی تھی مگر باہر آ کر مجھے مان لینا پڑا کہ وہ ہے اور بڑے زور شور سے ہے۔ اُس کی مہربانیوں سے باہر آتے ہی میرے جوان ہاتھ اور زیادہ لمبے اور توانا ہو گئے اور میں دونوں ہاتھوں سے دولت بٹورنے لگا۔

باہر اور تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ بس رہنا وہیں پڑتا تھا۔ ایک بار ڈال سے ٹوٹے تو زندگی بھر زمین چاٹنی پڑ جاتی تھی اور جو پھل ڈال سے گر جاتا ہے نیچے اُس پر کیڑے مکوڑے حملہ کر دیتے ہیں۔ میں دو سال کے کنٹریکٹ پر آیا تھا۔ کوئی لگاتار وہیں رہتا جائے تو کنٹریکٹ اپنے آپ بڑھتا جاتا ہے۔ چھوڑ کر چلا جائے تو دوبارہ کنٹریکٹ ملنے کا کوئی بھروسہ نہیں۔ کام لینے والوں کو ہاتھوں کی ضرورت رہتی ہے اور بے شمار ہاتھ، ایک سے ایک بڑھیا ہنرمند، ہاتھوں ہاتھ بکنے کو دُکانوں پر سجے تیار ملتے ہیں۔ ہاتھ بیچنے والوں کی کاٹ دُور دُور تک مار کرتی رہتی ہے۔

میں پورے بیس سال باہر کام پر ڈٹا رہا اور دونوں ہاتھوں سے دولت رولتا رہا۔ باپ نے کئی بار لکھا واپس آ جاؤ۔ میں نے جواب دیا بس اگلے سال۔ باپ نے لکھا تمہاری ماں سخت بیمار ہے۔ میں نے اُس کے علاج کے لئے موٹا چیک بھیج دیا۔ اب جب بھی اُن کا بلاوہ آتا میں اِشارہ سمجھ کر چیک سے اُن کا منہ بند کر دیتا۔ ایک خط میں میری ماں کے چل بسنے کی اِطلاع آئی۔ میں نے سوچا جانے والی تو چلی گئی۔ اب وہاں راکھ کے سوا اور کیا رکھا ہو گا۔

اَب میرے باپ کو اور زیادہ آرام کی ضرورت تھی۔ میں نے پیسوں کی نہر کھود کر اُس کا رُخ اپنے باپ کے گھر مندر والی گلی کی طرف موڑ دیا کیونکہ وہ اب ریٹائر بھی ہو چکے تھے

اکیسویں سال میں واپس وطن پہنچا۔ مجھے تو ابھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ بس ایک مشین نے میرے ایک ہاتھ کو ناکارہ کر کے مجھے واپس بھیج دیا تھا۔ جہاز سے اُترتے اور باہر آتے ہی میں نے ٹیکسی لی۔ میں نے اُسے پتہ بتایا تو وہ بولا۔ "صاحب میں اُدھر سے کئی بار گذرا ہوں۔ مندر والی گلی تو وہاں کوئی نہیں۔"

"تم چلو تو سہی۔ میں خود ہی تلاش کر لوں گا۔ مجھے سارے علاقے کا علم ہے۔" میں نے کہا۔

"صاحب۔ بعد میں جھگڑا نہیں کرنا۔ جگہ تلاش کرنے پر پیسے کچھ زیادہ ہو جائیں گے۔" وہ بولا۔

"یار تم میٹر سے بھی ڈبل چارج کر لینا۔ اب چلو۔" سالا مجھ سے پیسے کی بات کرتا ہے۔ میں نے دِل میں سوچا۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ روپے بنیں گے۔ میں ایک صفر ساتھ لگا کر ڈیڑھ سو ہنستے ہوئے بائیں ہاتھ سے دے سکتا ہوں۔

وہ سچ کہتا تھا۔ اُس نام کی گلی اب وہاں کوئی بھی نہیں تھی اور سارے علاقے کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ خیر وہ تو اپنے پیسے کھرے کر کے چلتا بنا اور پُوچھتے پُوچھتے میری بھینٹ ایک پُرانے بزرگ اور واقف سے ہو گئی۔ اُس نے بتایا کہ گلی میں مسجد کے لئے ایک پلاٹ اَلاٹ کرنے کی بات چلی تھی مگر علاقہ کونسلر نے یہ کہہ کر کہ جب تک مُسلمانوں

کے سروں میں بدرم سلطان بود کا کیڑا موجود ہے، وہ اپنے علاقے کو پانی پت کا میدان نہیں بننے دے گا، پلاٹ چرچ کے نام الاٹ کروا لیا۔ تینوں دھرم استھانوں کے کرتا دھرتا گلی کا نیا نام اپنے اپنے ناموں مثلاً آریہ سماج مارگ سناتن دھرم پتھ، شاہراہِ گوردوارہ وغیرہ پر رکھنا چاہتے تھے مگر چرچ کے اضافے نے اس جھگڑے کے نپٹانے میں بھی ایک خاص رول ادا کیا اور سب اِسے ٹیمپل روڈ کا نام دینے پر رضامند ہو گئے اور آس پاس دکانوں اور کاروبار نے اُسے ایک بھرے پُرے بازار کی شکل دے دی۔ بزرگ نے دبے لفظوں میں یہ بھی بتا دیا کہ وہ کونسلر کی ایک سیاسی چال تھی۔ خیر صاحب مُجھے کیا۔ مجھے تو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ میرے باپ کے پاس بہت اچھا مکان، نوکر، جو بوقتِ ضرورت ڈرائیور بھی بن جاتا تھا۔ اور ایک چھوٹی سی گاڑی بھی تھی اور وہ صبح شام نہ صرف خود زور شور سے ایشور بھگتی میں مگن رہتا تھا بلکہ دونوں وقت باجے گاجے اور گھر کے چاروں اطراف لاؤڈ سپیکروں کے ساتھ بھجن کیرتن بھی کروایا کرتا تھا۔ اور اب مجھے روزگار کا دست نگر بھی نہیں رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بصارت اور سماعت تو اس سے محروم ہو چکا تھا۔

قفس

میرا تعارف جاننے کے لئے آپ کو میرے ساتھ صدیوں پیچھے جانا پڑے گا۔ میرے جیسے پہنچے ہوئے آدمی کی زندگی کو سمجھنے کے لئے اُس کے آغاز سے انجام تک جاننا ضروری بھی تو ہے۔ انجام! یہ میں کیا کہہ گیا ہوں۔ میرا تو کوئی انجام ہی نہیں۔ جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے۔ میں ازل سے ہی قائم تھا اور اَبد تک ہی قائم رہوں گا۔

بہت پیچھے جہاں تک تاریخ یاد آتی ہے، آپ نے مجھے لکشمن کے نام سے جانا، جس نے رام اور سیتا کے دِلوں کو ملانے کے لئے رام ہی کی طرح دھنش اُٹھا سکنے کی شکتی رکھنے کے باوجود میں نے اپنا حق چھوڑ دیا تھا۔ اُس کے بعد میں بھیشم پتامہ کے نام سے آپ کی یادداشت میں محفوظ ہوا۔ جس نے اپنے بوڑھے باپ کے عشق کے لئے اپنا راج پاٹھ اور تمام حقوق تیاگ کر، عُمر بھر شادی تک نہ کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ میرے کرشن نام سے تو آپ بخوبی واقف ہوں گے جس کی سگی بہن سبھدرا کو ارجن اُن کے سامنے بھگا لے گیا تھا مگر میں نے اپنے بھائی بلرام کو اِس لئے اُس کا پیچھا کرنے یا مارنے سے روک لیا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میری بہن خود ارجن کے پریم کی دیوانی تھی۔

آگے چل کر اور شیکسپیئر بن کر میں نے رومیو جیولٹ کے نہ مل سکنے پر خون کے آنسو بہائے۔ اور اُن کی محبت کو ایک لافانی شاہکار کا رُوپ دیا۔ وارث شاہ بن کر ہیر اور رانجھے کی ناکام مگر سچی محبت کو میں نے اپنے قلم کے پر مہیا کر کے دُنیا کے کونے کونے تک پہنچایا اور اَمرِتا پریتم گواہ ہے کہ میں خود بھی اُن پر ہوئے مظالم پر آنسو رو دیا کہ میرے آنسو محبت کرنے والوں کے غمگساروں کی آنکھوں کے پُر درد آنسو بن گئے۔ وہ میں ہی تھا جس نے رادھا اور کرشن کی محبت کو پُوجا استھانوں اور مندروں میں ایک اُونچا اور پرستش کے قابل مقام عطا کیا حالانکہ سب جانتے ہیں کہ اُنہوں نے شادی کئے بغیر عاشق اور معشوق کی سی محبت کی تھی۔

سسّی پنّوں، سوہنی ماہیوال، لیلیٰ مجنوں کس کس کا ذکر کروں۔ میں نے اُن کی محبتوں کو اپنے خلوص اور قلم سے اَمر بنا دیا۔ دُنیا کا کون سا کونہ ہے جس میں میں نے محبت کرنے والوں کو ایک بہت بڑا نام عطا نہیں کیا۔ ہندو مُسلم سِکھ عیسائی، شمال جنوب مشرق مغرب، میں نے محبت کرنے والوں کو مِلنے ملانے میں پُورا تعاون دیا۔ جب کسی ہندو لڑکی

نے مُسلم سے یا مُسلم لڑکی نے کسی ہندو سے محبت کی اور اُن کے خلاف طوفان اُٹھے، میں نے اپنے قلم کو تمام مذہبی دیوانگیوں سے اُوپر رکھ کر اُن کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں لکھا بلکہ اُلٹا مذہب کے ایسے ٹھیکیداروں کے خلاف قلم کو تلوار بنا لیا۔ اکبر کے زمانہ میں باز بہادر اور رُوپ متی کی محبت کی کہانی پُرانی سہی اُردو ادیب کرشن چندر اور سلمیٰ صدیقی کی داستانِ محبت تو ابھی کل ہی کی بات ہے۔ مجال ہے جو میں نے مذہبی جنونیوں کے ساتھ کندھا جوڑا ہو اور کرشن سلمیٰ کی محبت کے خِلاف ایک بھی لفظ لِکھا ہو۔

آپ مجھے لافانی نہیں مانتے، نہ مانیئے مگر آپ کو یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ قُقنس کی طرح میں اپنی ہی راکھ سے بار بار جنم لیتا اور محبت کے ترانے گا تا رہا ہوں۔

میں نے محبت کی ہزاروں سچی داستانیں قلم بند کر کے اُنہیں لافانی رُوپ دیا۔ جب میرے پاس محبت کی ایسی داستانوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو میں نے خود ہی اپنے ذہن سے 'دیوداس' قسم کی فرضی داستانیں گھڑنی شروع کر دیں اور اپنی اِن جھوٹی داستانوں کو اِتنا خوبصورت اور قریبِ حقیقت رُوپ دیا کہ دنیا کو اُن کی نقل بھی اصل سے زیادہ خوبصورت نظر آنے لگی۔ میں نے محبت کرنے والوں کی راہوں میں روڑے اٹکانے والوں کو نہ صرف دِل، دماغ بلکہ جسمانی ساخت میں بھی بدہیئت اور وِلن بنا کر پیش کیا۔ میں نے آردیشیر ایرانی، وی شانتارام، دیو کی بوس، بی سی برووا، بمل رائے، محبوب، خواجہ احمد عباس اور راج کپور بن کر ایسی محبتوں کو ایسے فلمی شاہکاروں کا رُوپ دیا کہ دُنیا محبت کرنے والوں کے ساتھ جھوم، ناچ اور گا اُٹھی۔

میں نے میرا بن کر خود محبت کی اور محبت کے ترانے تخلیق کر کے اپنے محبوب کے شہر برِندابن کی گلی گلی میں گائے۔ میں نے زہر کے پیالے قبول کئے مگر اپنی محبت پر حرف نہیں آنے دیا۔ آپ مجھے ہر جگہ پائیں گے۔ اِسی لئے میں کہتا ہوں۔ اور ڈنکے کی چوٹ پر کہتا ہوں کہ میں امر ہوں، لافانی۔ کیا اب جب خود میں آپ کے سامنے اِمتحان کے سٹول پر آ بیٹھا ہوں تو اپنی تمام تاریخ یک قلم تلف کر کے اپنی تُقنیت ترک کر دُوں۔

میرے بیٹے نے کبھی میری حکم عدولی نہیں کی۔ میں اُسے ترقی کرتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر ترقی کا پیمانہ دولت ہے جیسا کہ آج کل کے زمانے میں سب کی نظروں میں ہے تو اُس نے باہر آ کر آٹھ سال کے عرصہ میں اتنی دولت کمائی جو میرے دادا، باپ اور خود میں نے اپنے وطن میں نہیں کمائی تھی۔ میرا بیٹا مغرب کے گُمراہ کُن ماحول میں رتی بھر نہیں بھٹکا، ہاں اُس نے میری بیوی کی نظروں میں ایک بہت بھاری غلطی ضرور ایسی کی، جس نے بقول اُس کے اُس کی دی ہوئی تمام تعلیم کے پرخچے اُڑا کر رکھ دئے۔ اُس نے ایک انگریز، غیر مذہب اور غیر معاشرے کی لڑکی سے محبت کی۔

میری بیوی نے پہلے تو اُسے ڈرایا، دھمکایا پھر عاق کر دینے کا رُعب دِکھایا مگر وہ کسی طرح باز نہ آیا اور اپنی ضد پر قائم رہا۔ کہا کہ شادی کروں گا تو اس انگریز لڑکی روزی سے، ورنہ زندگی بھر کنوارا بیٹھا رہوں گا۔ جب میری بیوی نے دیکھا کہ وہ کسی طرح قابو میں نہیں آ رہا ہے تو اس نے مجھے بیچ میں ڈالنے کی کوشش کی۔ کہا کہ لڑکا ہاتھ سے جا رہا ہے۔

میں نے کہا۔ "کہاں جا رہا ہے یہیں تو رہتا ہے ہمارے پاس۔"

وہ بولی۔ "آپ کی عقل پر تو پتھر پڑ گئے ہیں۔ قلم گھِسا گھِسا کر دماغ بھی گھِسا لیا ہے۔ لڑکی اور اُس کا کلچر ملتا ہے کیا؟"

میں نے کہا۔ "کلچر تو شاید نہیں ملتا مگر دِل مِلتا ہے۔"

میری بیوی نے ماتھا پیٹ لیا۔ وہ روتی رہی۔ کھانا پینا تک چھوڑ دیا۔ بیمار پڑ گئی مگر میں اُسکی کوئی مدد نہ کر سکا۔ میں کیا کرتا۔ اپنے دِل کو کیسے سمجھاتا کہ میں نے جو آج تک محبت کے گیت گائے ہیں وہ سب جھوٹے تھے۔ اور ان گیتوں اور افسانوں پر مجھے جو حکومتِ وقت اور سماج کے ٹھیکیداروں نے اِنعامات واکرامات سے نوازا تھا، وُہ سب بکواس تھے۔ میں اپنے ہی دِل کی آواز اور قلم کی تخلیقات کو رَد نہ کر سکا اور اپنے بیٹے کا ساتھی بن گیا۔

ایکدن بیٹے نے کہا۔ "میں روزی کے ساتھ اپنی بہنوں سے مِلنے امریکہ جاؤں گا۔"

میری بیوی چیخ اُٹھی۔ "نہیں تم اِس صورت میں وہاں نہیں جاؤ گے۔"

میں بھی بیوی کی آواز میں آواز ملا کر اُس سے ڈبل آواز میں چیخ اُٹھا۔ "نہیں تم اِس صورت میں وہاں نہیں جاؤ گے۔"

میرے نئے رُخ پر حیران ہو کر میری بیوی نے میری طرف دیکھا۔ بیٹا بھی ایک بار میری چیخ سے کانپ اُٹھا۔ میں نے کہا: "روزی کے ساتھ وہاں جانا ہے تو اُسے بیوی بنا کر لے جاؤ۔ ہمارا معاشرہ یہ بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ والا معاملہ پسند نہیں کرتا۔ کہنا تو "میں برداشت نہیں کرتا" چاہتا تھا مگر موقعے کے مطابق میں نے پسند کا لفظ استعمال کر لیا حالانکہ اِس سلسلے میں مجھے اپنا مذہب بھی کانا نظر آتا تھا جب میں ہر روز رادھا اور کرشن کی مُورتی کی پُوجا کرتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُن میں بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ والا معاملہ نہیں تو اور کیا تھا۔

ہندوستان کی چھیالیس سالہ آزادی کے جمہوری اور غیر مذہبی نظام کے اثر نے میری بیوی کو کمزور کر دیا۔ وہ ایک اور ہم دو، جمہوری طور پر ہمارا پلڑا بھاری رہا اور آج میرا بیٹا اور اُس کی انگریز بیوی خوش و خرم زندگی گذار رہے ہیں اور میں بھی خوش ہوں یہ جانتے کے باوجود کہ میرا بڑھاپا خراب ہو گا کیونکہ میں نے اگر اپنی ریٹائیرمنٹ کی باقی عمر انڈیا میں گذاری تو میرے بیمار پڑنے پر میرے مُنہ میں پانی ڈالنے والا بھی کوئی نہیں ہو گا اور مر جانے پر میری چِتا کو آگ دِکھلانے والا بھی کوئی غیر ہو گا۔ اور اگر اپنا بڑھاپا میں نے اپنے بیٹے کے پاس یہاں مغرب میں گذارا تو وہ مجھے اپنے پاس نہیں رکھے گا اور بیمار پڑنے پر یہاں کے دستور کے مطابق بوڑھوں کے 'بیمار گھر' میں ڈال دے گا، جہاں میں یہاں کے طبیعات سے اچھی طرح واقف نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹروں کو اپنا دُکھ درد بیان نہیں کر سکوں گا۔ اور نہ ہی یہاں کے ساتھی بوڑھوں سے اپنا دُکھ بانٹ سکوں گا۔ اور یُوں ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں گا۔ مگر میں پھر بھی خوش ہوں کہ میں نے اپنے قلم کے ساتھ بے انصافی نہیں کی۔ مُفت کی واہ واہ اور انعامات نہیں بٹورے۔ اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دبایا۔ اگر محبت ہی خُدا ہے تو میں نے خدا کے نام کا غلط پرچار نہیں کیا۔

جیگلو

وہ بس میں اُس کے پاس آبیٹھا۔ "رمبا صاحب نمستے!"

رمبا کی آنکھوں نے اُس سے کسی بھی پہچان کا اظہار نہیں کیا تو وہ بولا۔ "رمبا صاحب۔ آپکو تو سارا نارد دے جانتا ہے۔ میں اکثر آپکی کہانیاں پڑھا کرتا ہوں۔" پھر اُس نے خود ہی محسوس کیا کہ اُسے رمبا صاحب کا نہیں اپنا تعارف کرانا چاہیئے تو وہ بولا۔ "میرا نام پریم ہے۔ اگر زہسپتال میں فی زیوتھریپسٹ (PHYSIOTHERAPIST) ہوں۔ لکھتا بھی ہوں۔ تمکین تخلص ہے۔"

"شاعر ہو؟" رمبا نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ تخلص تو شاعروں کے ہی ہوتے ہیں۔" رمبا کے سوال پر اس نے حیران اور مشکوک نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ یہ سوچتا ہوا کہ وہ رمبا کہانی کار ہی ہے یا اُس کا کوئی ہم شکل۔

وہ گاہے بگاہے رمبا کے ہاں آنے اور اپنی شاعری سُنانے لگا۔ یہ ایک قسم کا یک طرفہ ٹریفک تھا کیونکہ شاعری کہیں بھی سنائی جا سکتی ہے جبکہ افسانہ طویل ہونے کی وجہ سے سُننے کی نہیں پڑھنے کی چیز ہے۔

جو چیز رمبا کو اُس کے قریب لے گئی وہ اُس کی جیسی تیسی شاعری میں جھلکتا موجود پنجاب کا درد تھا۔ گو پنجاب رمبا چالیس سال پہلے چھوڑ چکا تھا مگر پھر بھی دُور کہیں اُس کے اندر اپنی جنم بھومی کی مٹی اپنے سُکھ دُکھ کے گل و غبار پیدا کرتی رہتی تھی جو کبھی اُس کی سانسوں کو مُعطر کرتے اور کبھی اُس کی پسلیوں میں چُبھتے رہتے تھے۔

جب مزید ملاقاتیں اُنہیں بے تکلف دوست بنانے لگیں تو رمبا اُسے مذاقاً نمکین کہنے لگا اور وہ اُسے نارد۔ بولا۔ "افسانہ نگار نارد مُنی ہی تو ہوتا ہے۔ اِدھر اُدھر سے باتیں سُن کر آگے پہنچاتا رہتا ہے مگر یار سچ سچ بتاؤ۔ تمہیں میرے اِس نام نمکین کا علم کیسے ہوا۔ وہ بھی یہی کہتا تھا۔

رمبا نے ڈینگ ماری۔ "اُوپر والے کی طرح ادیب بڑا کارساز اور کاریگر ہے۔ اس لئے اُسے کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ کبھی کسی نے افسانہ نگار سے یہ پُوچھنے کا حوصلہ کیا ہے کہ جب تم لکھ رہے ہو کہ وہ دونوں عاشق معشوق بند

کمرے میں اکیلے ہم آغوش تھے تو تم تیسرے شخص قلم سنبھالے اُنہیں کہاں سے دیکھ رہے تھے۔ بھئی ادیب اور خُدا ہر جگہ حاضر و ناظر زندگی کی کاریں بنانے اور بگاڑنے کے شغل میں معروف رہتے ہیں اور کوئی اُن سے باز پُرس نہیں کر سکتا اس لئے اس سلسلے میں منہ بند ہی رکھو تو اچھا ہے۔" رہبانے طویل لیکچر پلا کر مجھے خاموش کر دیا۔

پریم اپنے بارے میں خود ہی بتانے لگا۔ "ایک جہازی تھا، مُرغ بازی، بٹیر بازی، تاش بازی، جُوئے بازی، رنڈی بازی، ہر قسم کی بازیاں کھیلتا تھا۔ اُسی نے میرا نام لونڈا نمکین رکھا تھا اور اپنے ساتھ جرمنی لے آیا تھا۔ تب جرمنی لیبر کی کمی کی وجہ سے اَن آتھورائزڈ ——— (UNAUTHORISED) سستے ہاتھوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتا تھا جو کچھ بھی کام کر سکتے تھے۔ تین مہینے کے ٹورسٹ ویزا پر آئے لوگ پانچ پانچ دس دس سال جرمنی میں ڈٹے رہتے تھے اور پولیس اُنہیں نظر انداز کرتی تھی۔ کمائی کے مواقع زیادہ دیکھ کر میں نے عرشے سے فرش پر چھلانگ ماری، یار کو اَلوداعی سیلوٹ مارا اور جرمنی میں لنگر ڈال دیئے۔ ہائم (ہوسٹل) جس میں میں مقیم ہوا، وہاں میرے دوسرے ہم وطن دن بھر اخباریں بیچتے، منڈی میں سبزی ڈھوتے یا ہوٹلوں میں برتن دھوتے تھے اور میں بیئر کی تین چار بوتلیں چڑھائے پڑا رہتا تھا کیونکہ میری دکانداری شام کو شروع ہوتی تھی جب لوکالوں، ریسٹورنٹوں، پبوں اور باروں میں سارے جرمن جوان بُڈھے بُڈھیاں وہسکی، بیئر اور وائن کے گلاسوں کے گرد جمع ہوتے تھے۔ وہیں کوئی نہ کوئی بُڈھا یا بُڈھی مجھے اپنے گھر لے جاتی اور رات ایک یا دو بجے فارغ کرا کر فارغ ہو، میری ہتھیلی پر پچاس یا سو مارک کا نوٹ رکھ اور ٹیکسی کا کرایہ دے کر خود تسکین آمیز خراٹوں کی دُنیا میں ڈوب جاتی تھی۔ میں دو اڑھائی بجے گھر آ جاتا اور ڈیرہ داریوں کی طرح صبح دیر تک سویا رہتا کہ مجھے جہازی کی سنگت کے بعد یہی ایک گُن آتا تھا۔

میں اپنی دُنیا میں مست تھا۔ آمدنی بھی دوسرے کام کرنے والوں سے چار پیسے زیادہ ہی تھی اس لئے مجھے آس پاس کا ہوش ہی نہیں تھا۔ ہوتا بھی کیسے جبکہ میرے دن اور راتوں کا سلسلہ ہی اُلٹ تھا اس لئے وقت کے اُلٹے پیئوں کی چال میں نہ دیکھ سکا اور جرمنی جب ان بے سند ہاتھوں کو دھتا بتانے لگا تو مجھے بھی سمندر کی ایک نئی لہر نے ایک نئے کنارے پھینک دیا۔ آنکھیں کھلیں تو میں نے دیکھا سامنے اوسلو کا لال رنگ کا سٹی ہال مجھے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

چند روز آرام کرنے کے بعد میں اپنی مارکیٹ کی تلاش میں نکلا مگر جلدی ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ سکہ جو جرمنی میں مہنگے داموں چلتا تھا اُس کی قیمت یہاں ناروے میں بہت ہی کم ہے۔ مجبوراً میں دوسری لائن کے بارے میں سوچنے لگا۔ اپنے وطن میں کندھے پر فولڈنگ کُرسی لٹکائے، ہاتھوں میں تیل کی رنگ برنگی شیشوں کا چھینکا لئے چار چار آنے کی کمائی کے لئے تیل مالش، تیل مالش چلاتا سردیوں، گرمیوں سڑکوں پر مارا مارا پھرتا تھا۔ وہیں ایک قدردان فارنر نے صلاح دی تھی کہ اپنے آرٹ کو پہچانو، باہر نکلو۔ اب اُس کی پُرخلوص رائے نے پھر سے دماغ میں چونچ ماری اور میرے اندر کا سارا آرٹ پھر سے جاگ اُٹھا۔ یہاں جس کا ذرا تختہ بھی درد کرتا ہے، سیدھا فزیوتھراپسٹ کے پاس بھاگتا ہے۔ اَسی فی صدی گُن اپنے پلّے تھا ہی، باقی تھوڑی سی ٹریننگ سے پُورا کر لیا۔ بس تقدیر نے ساتھ دے کر اور مجھے فزیوتھراپسٹ بنا کر یہاں کے بڑے ہسپتال اُکرز پہنچا دیا۔

گاڑی ٹھیک چل رہی تھی مگر میں نے مشرقی ڈھنگ سے سوچا کہ بیوی کمائے گی اور تنخواہ لاکر میرے ہاتھ پر دھر دیا کرے گی تو چار پیسوں سے جیب اور زیادہ بھاری ہو جائے گی مگر اس سے پہلے کہ وہ کمانے اور تنخواہ لانے کی سٹیج تک پہنچتی، اُس نے مجھے ایک بچے کا باپ بنا دیا اور اِس طرح نہ صرف وہ خود بلکہ ننھا سا ایک مُنہ اور میری کمائی کا حصّہ دار بن گیا اور نارویجین قانون مجھ سے تقریباً میری آدھی تنخواہ میری میم بیوی کی جھولی میں ڈالنے لگا۔ ارے یہ پلاننگ تو فیل ہو گئی۔ میں نے سوچا طلاق حاصل کروں، جان چھڑاؤں اور مُلک جاکر ایک تابعدار بیوی لے آؤں۔ کافی دیر بعد طلاق تو مِل گئی مگر چھٹکارہ نہ مِل سکا۔ قانون نے مجھے میری میم بیوی سے تو آزاد کر دیا مگر اُس کے اور بچے کے اخراجات سے نجات نہ دِلوا سکا اور میری تنخواہ کا ایک بڑا حصّہ اُنہیں مِلنے لگا۔ اِس بیچ وطن جاکر میں نے ایک اور شادی رچالی۔ اب ایک بیوی انڈیا میں، دُوسری یہاں۔ روٹیاں دو دو، پیٹ اپنا خالی۔ میں نے پینترا بدلا اور ایک گرل فرینڈ رکھ لی۔ گرل فرینڈ رکھنے میں ایک فائدہ ہے۔ تم اپنا کماؤ اور کھاؤ، وہ اپنا کمائے اور موج کرے۔ جب تک دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ دوستی چالو۔ ضرورت کم محسوس ہو یا ذائقہ بدلنے کا شوق چرائے تو تمہاری راہ یہ۔ اُسکی وہ۔ مگر میرا اندازہ غلط نِکلا اور مجھے بعد میں پتہ چلا کہ گرل فرینڈس ایک پائی بھی نہیں لیتیں مگر تحفے تحائف اور ریستورانوں، کلبوں میں ہزاروں پائیاں خرچ کروا دیتی ہیں۔ چنانچہ اَب میرا خرچ بھی تین گنا بڑھ گیا۔ اخراجات تین گنا، نوکری ایک اور چسکہ موجود۔ فی زیُوتھراپسٹ تو تھا ہی۔ خرچوں کو نبھانے کے لئے میں نے ورزشیں کرنے کا ایک سٹوڈیو کھول لیا، جہاں ورزش کرنے کے درجنوں سامان موجود تھے۔ علاقے کے مرد اور عورتیں جسم کو صحت مند اور متوازن رکھنے کے لئے وہاں آنے لگے۔"

سٹوڈیو نہیں چلتا تھا اسی لئے کسی نے اُسے اُسکے سر منڈھ دیا تھا۔ ایک دن وہ رمبا کے پاس آیا۔ بولا: "اب شیڈیو میں یوگا کی کلاسیں بھی لگایا کروں گا۔"

"تم یوگی کب سے بن گئے ہو؟" رمبا نے پوچھا۔

"پہلے تم مجھے یوگا پر تمام کتابیں دِلواؤ۔ جس دِن اُنہیں ختم کر لوں گا۔ اُسی دِن سے یوگی بھی ہو جاؤں گا۔" وہ بولا۔

رمبا نے اپنی لائبریری سے یوگا پر میسر تمام کتابیں اُسے دِلوا دیں۔

کچھ دنوں بعد وہ پھر اُس کے پاس آیا۔ بولا۔ "انڈیا جا رہا ہوں۔ یوگا پر مزید کتابیں خریدنے۔ تمہاری دی ہوئی کتابیں کم پڑ گئی ہیں۔" "جانے پر اتنا خرچ کرو گے۔ کتابوں کے عنوانات لِکھ کر کسی بھی اچھی فرم سے بذریعہ ڈاک منگوا سکتے ہو۔" رمبا نے پُرخلوص رائے پیش کی۔

اُسے دوست کی رائے پسند نہیں آئی۔ مُنہ بگاڑ کر بولا۔ "رمبا د۔ تم مجھے اتنا بے وقوف سمجھتے ہو کہ دس پیسے کا کام، دس روپے میں کروں گا۔ یہ سارا خرچہ سٹوڈیو کے نام ڈال دوں گا۔ ٹیکس میں سے پورا ہو جائے گا۔ میں کوئی کچی گولیاں تو نہیں کھیلا۔ اُدھر بیوی سے بھی مِل آؤں گا۔"

اپنے دیس میں اپنی زبان بولنے والے کروڑوں لوگوں سے دو چار دوست چن لینا ذرا بھی مشکل نہیں مگر

باہر اور خاص طور پر ناروے میں چند ہزار مشرقی بھائیوں سے مجبوراً کسی ایک دو کو ہم زبان جانا پڑتا ہے۔ ایک دن رمبا کو اُس کے ساتھ اُس کا ہٹ دیکھنے جانا پڑ گیا۔ ہاں دُور ایک جھیل کنارے اب اس نے ایک ہٹ بھی خرید لیا تھا۔ راستے میں باتوں سے ہی پتہ چل گیا کہ وہ اُسے اپنی کچھ نئی کرتیا میں سُنانا چاہتا تھا۔ ہٹ اُونچی نیچی پہاڑی پر واقع تھا۔ ماحول بہت دل نشیں تھا۔ سامنے جھیل، اُس میں تیرتی مُرغابیاں، کھِلتے پھُول، اور ہٹ کے پائیں باغ میں مُسکراتے پھُول، چیری، سیب اور آلوچے کے پیڑ ۔۔۔ رمبا نے پُوچھا ۔۔۔ "کتنے میں خریدا ہے ؟"

پریم نے اُسے چڑاتے ہوئے جیسے خود کو چڑا کر کہا: "خریدا ہے ؟" پھر مُسکرا کر بولا۔ "داؤ مارا ہے"

رمبا نے وضاحت چاہی تو اُس کی باچھیں اور زیادہ کھِل گئیں۔ بولا: "ایک بُڈھا مر رہا تھا۔ میں نے اُس کی وہ خدمت کی، وہ خدمت کی کہ سارا ہٹ ہی میرے نام لکھ گیا۔

خدمت ؟ اور تم۔ تم پیسے کے پیر۔ مُفت میں کسی کو اپنی اُنگلی کی پور تک نہیں لگاتے۔ مجھے تو شک ہے اُس کی کوئی رگ ۔۔۔۔۔ "رمبا نے اپنی گردن پر اُنگلی رکھ کر اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔

پریم نے اُس کی بات کا ذرا بھی بُرا نہیں منایا۔ ہنس کر بولا۔ "تم تو جانتے ہو، بڑھاپے میں خواہشات اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ میں اندھا تو نہیں، صاف نظر آ رہا تھا کہ میری خدمت آگے چل کر رنگ لانے والی ہے"

ایک دن وہ رمبا کے پاس آیا تو رمبا نے پُوچھا۔ "کیا حال ہے پریم ؟"

وہ بولا۔ "آج سے میں پریم نہیں، پرمانند اچاریہ ہوں"

"یہ کیسا نام ہے ؟" رمبا نے پوچھا۔

"یہی تو نام ہے" وہ بولا۔ "اچھا رہے یار" ہاں نام بدلنے کا خیال ذہن میں آتے ہی وہ اُسے اَدھورے نام سے بھی بُلانے لگا تھا۔ شاید اُس کے خیال میں اب اُس کا درجہ رمبا سے بہت اُونچا ہو گیا تھا۔ "اب میری یوگا کی کلاسیں خوب چلنے لگی ہیں۔ دراصل یہاں لڑکیاں ہر ہندوستانی کو یوگی سمجھتی ہیں۔ جب یہ نقلی سکہ یہاں چلتا ہے تو اپنا کھنکھناتا ہندوستانی سکہ کیوں خرچ کیا جائے۔ ویسے سچ تو یہ ہے کہ اپنی انڈین کرنسی فارن میں چلتی ہی کہاں ہے۔ لے دے کر اور رگڑے کھا کھا کر ان ہی کی کرنسی کماتے ہیں اور ان ہی کے مُنہ پر دے مارتے ہیں۔ کہیں جیب میں ایک آدھ سوراخ ہوا تو تھوڑے سے بہت پاؤنڈ، ڈالر، مارک یا کرونر اپنے مُلک کی طرف بھی لیک کر جاتے ہیں تو تھوڑی سی خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اپنا ملک جو ہمیں یہ نند اچاریہ قسم کے نام بخشتا ہے۔ ہم اُسکے بھی کسی کام آئے"

اُس کی یوگا کی کلاسوں کی کامیابی بھی چند روزہ لہر تھی، جو آ کر اب جا چکی تھی مگر اُسے جسمانی چھیڑ چھاڑ کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا تھا اس لئے اُس نے اسی لائن میں دوسرے حربے آزمانے شروع کئے۔ ایک دن بولا: "لوگ جسم کے ہر عضو سے کماتے ہیں۔ کیا آنکھیں کام نہیں کرتیں۔ کان کام نہیں آتے۔ پیروں سے سائیکل رکشا نہیں چلایا جاتا۔ سلائی کی اور دوسری کئی مشینیں نہیں چلتیں۔ موٹر ڈرائیوروں کے دونوں پیر کلچ، بریک اور ایکسیلیٹر پر نہیں رہتے۔ اب تو اندھے بھی کُرسیوں، چارپائیوں وغیرہ کی بُنائی کرنے لگے ہیں مگر نہ جانے جسم کے بیچ کے اعضا نے کیا قصور کیا ہے کہ ہم انہیں کمانے

کہ کسی کام میں شامل کرتے ہوئے ہتک محسوس کرتے ہیں نتیجتاً وہ زنگ آلود ہو کر بہت عرصہ پہلے اپنی رگیں ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں۔ میں نے اِن سے بھی کام لینا شروع کر دیا ہے تو کیا بُرا کیا ہے۔ مالش کرتے ہوئے میں اُن کی ذرا سی ایک خاص رگ دبا دیتا ہوں اور جب اُنکی خواہش بڑھ جاتی ہے تو میرا ریٹ بڑھ جاتا ہے۔ بھائی یہ ڈیمانڈ اینڈ سپلائی کا کھیل ہے۔ میں نے عورتوں پر بہت پیسہ خرچ کیا ہے اَب اُن ہی سے کما رہا ہوں۔ آپ جُوئے میں پیسہ ہاریں گے تو جُوئے سے ہی پُورا کریں گے نا۔۔

سنڈیو شاید سفید ہاتھی تھا، جو کھاتا زیادہ، کماتا کم تھا اور جسے رام کرنے کے اُس کے تمام ہتھکنڈے فیل ہوتے جا رہے تھے۔ ایک دن وہ رمبا کے پاس آیا اور اُسے بانہہ سے پکڑ کر اُٹھاتا ہوا بولا۔ ”رمبا صاحب اُٹھو۔ فوراً میرے ساتھ چلو۔“ اُس نے ایک زمانے کے بعد رمبا کو پُورے نام سے بُلاتے ہوئے صاحب کا دُم چھلا بھی ساتھ لگایا تھا۔ ”ایمبیسی سے میرے غیر شادی شدہ ہونے کا سرٹیفکیٹ دِلواؤ۔“

”مگر تم تو شادی شدہ ہو۔“ رمبا نے کہا۔ ”اور تمہیں اَب ایسے سرٹیفکیٹ کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے۔“

”انڈین بیوی کو میں نے طلاق دے دی ہے۔ یہ رہے کاغذات۔“ اُس نے اپنے اَلم غلم کاغذات سے حاملہ بریف کیس سے کچھ کاغذات تلاش کر کے رمبا کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ دراصل ایک اور میم سے شادی کرنے کا ارادہ ہے۔“

”تمہیں اَبھی عقل نہیں آئی۔“ رمبا کو غصّہ آ گیا۔ پہلی بیوی کو بچّے کے ساتھ چھوڑ چکے ہو۔“

”یار تُو ناراض نہ ہوا کر۔ تیرا اِتنا خوبصورت چہرہ ہے، غصّہ کرتا ہے تو تیری شکل بگڑ جاتی ہے۔“ وہ خوشامد پر اُتر آیا۔ ”اب تجھ سے کیا چُھپانا۔ بُڈھی میم قریب المرگ ہے۔ شادی ہو جائے تو اُس کا سب کچھ...... کیا کروں سنڈیو کو بھی تو سہارا دینا ہے۔“

سٹینڈ بائی

آخر ارشد علی کی پُرخلوص کوششوں یا اپنی غرضوں سے بُلبل اُنکے منڈیر پر آ بیٹھی۔ کاغذات بھرے گئے۔ شادی نامہ دستخط ہوا اور وہ ایک تار میں بندھ گئے۔ اُسکے بعد تو راجکمار اور بھی زیادہ مشغول ہوگیا۔ دن بھر گھر پر پڑا پلنگ توڑتا رہتا۔ اُٹھتا، کھاتا پیتا اور پھر بستر پر۔ کھانے کے بعد جھوٹے برتن واشن بیسن میں ڈھیر کرتا جاتا۔ بُلبل شام کو دفتر سے واپس آتی تو بیسیوں کام اُس کی راہ دیکھ رہے ہوتے اور راجکمار کی باہیں نہیں، پُوری دو بوتلوں کی بیئر خراٹوں کی صورت اُسے خوش آمدید کہتی۔ وہ اُسے اُٹھاتی۔ اخبار کا کوئی صفحہ سامنے رکھ کر کہتی۔ "تم تو سو رہے تھے۔ صبح میں صفحہ مارک کر گئی تھی۔ اچھی جگہ تھی۔ عرضی بھیجی؟ ٹیلی فون کیا؟؟"

راجکمار نیند بھری آنکھوں سے اخبار اُلٹا پکڑ لیتا۔ "کہاں؟ کس کو؟؟" وہ پوچھتا۔

وہ جھنجھلا کر کچن میں کھانا پکانے سے جوجھنے لگتی۔ تب تک بیئر پھر راجکمار کو لمبا ڈال لیتی۔ بُلبل کھانا پلیٹ میں بھر کر اُسے ایسے کھِلاتی جیسے ماں بچے کے گلے میں بِب باندھ کر چمچہ چمچہ کھِلاتی ہے۔ بعض اوقات تو راجکمار اپنے کپڑے اور بستر تک بھی خراب کر دیتا۔

چھ مہینے ایسے ہی نکل گئے۔ بہت ہو لیا۔ یُورپین بُلبل نے سوچا اور ایکدن جب راجکمار کسی کام سے باہر نکلا تو بُلبل نے اُس کا سامان، سامان کیا تھا، ایک بیگ اور ایک چھوٹا سا اٹیچی دروازے پر رکھ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ وہ گھنٹہ بھر دروازہ دھڑ دھڑاتا رہا۔ آخر بُلبل نے آدھا دروازہ کھول کر کہا: "راجکمار اِس ریاست سے تو اب تمہیں بن باس عطا ہوا۔ جہاں رہو، سُکھی رہو۔ بس ذرا ٹیلی فون پر اپنا پتہ بتا دینا۔ فارغ خطی کے کاغذات بھجوا دونگی۔ دھڑاک!" اور اُس نے آدھا کھلا دروازہ مکمل بند کر دیا۔

خاک پھر اپنے ٹھیئے پر جا پہنچی۔ "ارشد بھائی۔ ظلم ہوگیا!"

"وہ تو ہونا ہی تھا!" ارشد نے کہا۔ جس میں صبر کی تلقین اور غصہ بھی شامل تھا۔ "مجھے پہلے سے ہی معلوم تھا مگر۔

شکر کرو کہ ٹکنے سے پہلے نہیں نکال دیئے گئے دودھ سے مکھی کی طرح۔ چلو اچھا ہوا۔ چند قطرے دودھ تو پی لیا،

اَب راجکمار کو یہاں قیام کا پکا اجازت نامہ مِل چکا تھا۔

کیا خیال ہے ذرا گردشِ ایام کو پیچھے کی طرف لے جائیں تو راجکمار کی بیک سٹوری معلوم ہو جائے گی۔ اور ہماری سٹوری کو آگے چلنے کو پہیئے مِل سکیں گے۔

تو سنیئے۔ یار لوگوں میں یہاں باہر اُس کا نام سٹینڈ بائی ہے اور اپنے وطن میں وہاں اُس کی . . . . مگر ٹھہریئے پہلے لفظ سٹینڈ بائی کی وضاحت کرلیں تو تمام بات ’کہانی یا قصہ‘ جو بھی آپ اُسے کہہ لیں۔ زیادہ واضح ہو جائے گا۔ انگریزی کی دو تین بہترین لُغات میں سٹینڈ بائی کے معنی کچھ اس طرح ہیں۔ وقت پر کام آنے والا، بھروسے کے قابل شخص، پاس کھڑا دیکھتے رہنے والا منتظر شخص، کہ کب اُس کی ضرورت محسوس ہو اور وہ اپنی خدمات پیش کر دے؛ سٹینڈ بائی کی یہ تمام تشریحات اُس پر پُوری اُترتی ہیں یا نہیں مگر یہاں اُس کے یاروں نے اُس کا یہ نام اِس لئے نہیں رکھا کہ وہ اِن تشریحات سے آگاہ ہیں بلکہ یہاں وہ سٹینڈ بائی اِس لئے ہے کہ وہ سیدھا سادا بیچارا سا آدمی ہے۔ دوست اور رشتہ دار اُس کا استحصال کرتے ہیں اور اُسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ کُند چھُری سے ذبح ہو رہا ہے۔ دوستوں کے کام میں اُسے نہ رات کا ہوش رہتا ہے اور نہ دِن کا پتہ۔ بے روزگاری کے اس دَور میں وہ اگر لائن میں سب سے آگے کسی نوکری کا اُمیدوار کھڑا ہو تو کسی بھی دوست کے لئے دست بردار ہو کر لائن میں پھر سے بالکل آخیر میں جا کھڑا ہو گا۔ ہاں اُسے خود اپنا ذرا بھی فِکر نہیں۔ کپڑے پھٹ رہے ہیں۔ پائینچے اُدھڑ رہے ہیں۔ گرمیوں میں سردیوں کے اور سردیوں میں گرمیوں کے کپڑے زیب تن ہیں۔ اُسے ہوش نہیں۔ اُس کا دوست ارشد علی کہتا ہے اور جب اتنا قریبی دوست کہتا ہے تو ٹھیک ہی کہتا ہو گا کہ ایک بار رات دیر گئے تک گپیں ہانکتے، ویڈیو پر فلم دیکھتے اُس کے کمرے پر مجھے دیر ہو گئی اور میں رات وہیں رہ گیا۔ صبح ٹائیلٹ گیا تو ٹائیلٹ پیپر ندارد۔ سوچا۔ پانی استعمال کرتا ہو گا مگر وہاں نہ ہی کوئی خالی بوتل یا کوئی ڈبہ ہی نظر آیا۔ آخر میں نے دِل کو یوں بہلا لیا کہ بھائی لوگوں کی خدمت میں غریب کو اتنی فرصت کہاں۔ خیر تلاشِ بسیار کے بعد وہاں ایک طرف کچی مٹی کی ڈھیری نظر آ گئی مگر یہ بہت بعد کی بات ہے۔

یہاں بھائی لوگ اُسے سٹینڈ بائی اُس کے استحصال کی وجہ سے بھلا کیوں کہنے لگے۔ یُوں تو اُن کا اپنا پردہ چاک ہو گا۔ وہ دراصل اُس کے اِس نام کے پڑنے کی وجہ دوسری ہے۔ آپ جاننا چاہتے ہیں تو پھر پہلے یہ جان لیجئے کہ سٹینڈ بائی ہوائی کمپنیوں کا ایک ایسا ٹکٹ ہوتا ہے جو عام قیمت سے بہت کم پر دستیاب ہو جاتا ہے۔ کرنا مسافر کو یہ ہوتا ہے کہ نام لکھوائے، رختِ سفر باندھے تیار بیٹھا رہے اور جب کمپنی کی اچانک کوئی سیٹ خالی پڑ جائے تو وہ اُسے پیش کر دی جائے اور سٹینڈ بائی صاحب سیلوٹ مارے حاضر جناب کہے اور جہاز پر سوار ہو کر راہیِ منزلِ مقصود ہو۔ دراصل ہمارے سٹینڈ بائی کو ایسے ٹکٹ کی اکثر ضرورت پڑتی ہی رہتی ہے جس کے لئے وہ ہر ایئر ایجنسی کے دفتر کی پرکرما کرتا رہتا ہے اور اُس کے انہی چکروں کے ایما پر یار لوگوں نے اُس کا یہ نام رکھ دیا ہے — اُسے اپنے اس نام پر کبھی کوئی اعتراض بھی نہیں ہوا۔ اپنے اچھے بھلے نام راجکمار کے بدلے یہ نام اُسے بُرا یا عجیب کیوں محسوس نہیں

ہوتا۔ یہ نہ اُس کے دوستوں کو سوچنے کی فرصت ہے اور نہ ضرورت۔ خود بھی جب اُسے کوئی اعتراض نہیں تو کوئی اس کی فِکر کیوں کرے۔ اب تو اس کا یہ نام اِس قدر زبان زدِ خاص و عام ہو گیا ہے کہ یار لوگوں کو اُس کا اصلی نام تک بھی بھُول چکا ہے۔

کہا ہے ناکہ خود اُسے بھی اِس نام پر کوئی اعتراض نہیں بلکہ اُلٹا اُسے یہ نام پسند بھی ہے۔ وجہ دراصل یہ ہے کہ یہ نام اُس کی ماں کے نام میراں بائی سے مِلتا جُلتا ہے اور اُسے اپنی ماں سے قُربت کا احساس دلاتا ہے۔ بیٹنڈ بائی، میراں بائی۔ کوئی آگے بڑھ کر تھام لے تو بیٹا اُسی کا ہے۔ اُسے کوئی کام لے لے تو لے ورنہ وہ بہت ہی سُست الوجود انسان ہے۔ اب آپ حیران ہو رہے ہوں گے۔ کہ اگر ایسی بات ہے تو پھر وہ اِتنی دُور سات سمندر پار یہاں کیسے پہنچ گیا مگر آپ نے اگر اوپر بتائی باتوں میں اُس کی اپنی ماں سے محبّت کو نوٹ کیا ہوتا تو آپ یہ سوال ہرگز نہ کرتے ــــ انڈیا میں میٹرک کرنے کے بعد ...... اب اُس کی اِتنی تعلیم حاصِل کر لینے کے پیچھے کی کہانی بھی سُن لیجیئے تاکہ بار بار کی سوک لوک بند ہو اور بات آگے چل سکے۔ وہ دراصل اُس کی سفید قمیض کے کف پر اُس کے والد صاحب جوابات لِکھ لِکھ کر اور اُسے پہنا کر امتحانات میں بھیجتے تھے مگر یہ سب پاپڑ بھی اَبا میاں کو پورے تین سال تک بیلنے پڑے تھے تب کہیں جاکر ہمارے ہیرو کو تھرڈ ڈویژن کا دسویں کا سرٹیفکیٹ حاصل ہو سکا تھا۔ میٹرک کرنے کے بعد کوئی کام تلاش کرنا تو ایک طرف، ملا بھی تو اُس نے جم کر نہیں کیا بلکہ دوسرے یا تیسرے دِن ہی چھوڑ چھاڑ کر گھر آ بیٹھتا رہا۔ اگلے دِن جب ابا جان اُسے دیر تک بستر میں لیٹے دیکھتے تو غُصّے سے اُس کے اوپر سے کمبل کھینچ لیتے اور وہ بنا ، اُف کئے یا ایک بھی حرف شکایت زبان پر لائے، کمبل کے بغیر گھٹنیاں میں گیند بنا باپ کی لعنت ملامت برداشت کرتا پڑا رہتا۔ تھک ہار کر جب باپ اپنے کام اور چھوٹے بھائی بہن سکول اور ماں مندر چلی جاتی تو وہ اُٹھتا نیچے بھی چادر کو کھینچ کر تہمد کی طرح باندھتا اور کچن میں جو کچھ مِلتا، کھا پی کر دوبارہ چار پائی پر دراز ہو جاتا۔ کچن میں اگر کھانے کو کچھ نہ ملتا تو وہ شکر کے ہی دو چار پھانکے مار کر اور پانی پی کر اُوپر والے کا شکر گزار ہو، دوبارہ سو جاتا۔

میراں بائی، اُس کی ماں اِسم بامسمی بنی سدا بھگوان کرشن کی بھگتنی بنی رہی تھی۔ دن رات بھجن گانا اور پاٹھ پوجا کرنا اُس کا معمول تھا۔ اُس نے خاوند کو بیوی کا اور بچوں کو ماں کا شکوہ بھُول کر بھی کبھی نہیں دیا تھا۔ بچے اُسے کسی شکراؤ قسم کے حادثے کی پیداوار محسوس ہوتے تھے اور حادثات کی طرف کون مُڑ کر دیکھنا پسند کرتا ہے۔ ہاں کبھی کبھی ممتا بہت جوش میں آتی اور بچے پر باپ کے مظالم برداشت نہ ہو سکتے تو کہتی۔ "بیری۔ ماں کا کلیجہ کھا اور یہاں سے دُور کہیں دفع ہو جا۔ روز روز جوتے کھاتا ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی"

مگر راجکمار اپنی چھوٹی سی پلنگڑی کی ریاست میں مست ایک کان سُنتا اور دوسرے کان سب کچھ دیکھا سُنا ہوا اَبر کر دیتا۔ کبھی جب بہت تنگ آتا تو کہتا۔ "ماں فلم ایکٹر راجکمار بُوڑھا ہو چلا ہے۔ اُسے ریٹائر ہو لینے دے اُس کی جگہ سنبھالونگا تو تجھے موتیوں میں تول دُونگا اور ڈیڈی کے بھی تمام گلے شکوے دُور کر دونگا"

ماں ماتھا پٹختی بھگوان کے دربار پہنچ جاتی۔ شاید بھگوان کے دربار نے اِسی پٹختے ماتھے نے یا ممتا کے کسی کمزور لمحے نے آخر اُسے ایک راہ سُجھادی کہ بیٹے سے چارپائی چھڑواؤ اور جدھر اُس کا منہ پھرے، اُدھر دھکیل دو۔ باہر نکلے گا، بھوک لگے گی تو ہاتھ پاؤں ہلائے گا۔ بیٹا بمبئی کے خواب دیکھتا تو رہا۔ ماں نے اپنے چند زیور بیچے: بمبئی کا تھرڈ کلاس ٹکٹ خریدا، اُسکے ہاتھ میں تھمایا اور گاڑی چڑھادیا: بمبئی پہنچ کر راجکمار، راجکمار سے ملا۔

اُسے بہت سمجھایا کہ شیر اب تیرے دانت اور پنجے گھس گئے ہیں۔ اب جنگل کا راج میرے سپرد کر اور تو سنیاس لے مگر راجکمار اِس گھور کلجگ میں جبکہ سنیاس کا تصور ہی ختم ہو چکا ہے اور بڑے بڑے بوڑھے چلچے ملے اپنی چندھی آنکھوں سے ٹٹول ٹٹول کر ابھی تک سیاست سے چپکے بیٹھے ہیں تو بھلا وہ اپنی سورگ پوری فلم نگری کی گدی چھوڑنے پر کیوں تیار ہوتا۔ چنانچہ ہمارا راجکمار تنگ آکر سمندر میں ڈوبنے پہنچ گیا۔ اور سمندر نے اُسے اپنی لہروں پر تیرا کر اِدھر فارن پہنچادیا۔ جونہی اُس کا جہاز یہاں پہنچا، اُس نے سمندری زندگی کو خیرباد کہا۔ اِس لئے کہ وہ جہاز کی بھٹی میں کافی کوئلہ جھونک چکا تھا۔ اور جیب میں چند سکے بھی موجود تھے۔ راجکمار جہاز سے اُترا اور سیدھا ریلوے پلیٹ فارم پر آگیا۔ جیب میں پیسے ہوں تو ریلوے پلیٹ فارم پر ہر چیز یعنی کھانا پینا، فراغت پانا اور سونا وغیرہ میسر آجاتا ہے۔ گاڑی چلتی رہی، جب تک چلتی رہی، جب رُک گئی تو راجکمار نے جیبیں اُلٹیں اور ریلوے کینٹین میں کام کرنے والے اپنے نئے دوست اَرشد علی کے حضور جا کھڑا ہوا۔ اُس وقت یہ ملک ہر دو ہاتھوں کو نعمتِ غیر مترقبہ کی طرح جھپٹتا تھا۔ اَرشد اُسے اپنے شیف کے پاس لے گیا۔ شیف نے راجکمار کو دوبار اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تک دیکھا اور جب اُسے اُس میں کوئی راجکماریت نہیں بلکہ تمام کی تمام مزدور کی چال، ڈھال اور کھال نظر آئی تو اُس نے اپنے پیڈ کا کاغذ ٹائپ رائٹر پر چڑھایا اور لکھ دیا کہ اُسے صفائی کے کام کے لئے راجکمار کی اَشد ضرورت ہے۔ چیف کا لیٹر ہاتھ میں لئے راجکمار نے اَرشد علی کی طرف دیکھا۔ ارشد علی بولا ... اپنے مُلک جاؤ۔ وہاں اِس مُلک کی ایمبیسی کو یہ لیٹر دو۔ وہ یہاں خط لکھ کر پولیس کے ذریعے چیف کے دوبارہ پوچھے گی کہ کیا واقعی تمہیں راجکمار کی سخت ضرورت ہے اور جب یہاں سے جواب ہاں میں جائے گا۔ تو تمہیں یہاں آنے، رہنے اور کام کرنے کا اجازت نامہ مل جائے گا۔"

راجکمار نے پہلے جیسی معصوم نظروں سے پھر اَرشد علی کی طرف دیکھا اور بنا ایک لفظ کہے دوبارہ اُس کے سامنے اپنی پتلون کی جیبیں اُلٹ دیں۔ ترس کھا کر اَرشد علی اُسے اپنے کمرے پر لے آیا مگر تین ہفتے میں ہی اُسے معلوم ہو گیا کہ راجکمار چائے وغیرہ تو اچھی بنالیتا ہے مگر فرج کا دشمن ہے اور اُس کا کھانے پینے سے بھرا فرج جو پہلے مہینہ بھر چلتا تھا، اَب دس پندرہ دِن سے زیادہ کی مار نہیں سہہ سکتا۔

ایکدن پھر آرام سے اَرشد علی نے اُسے گھیرا۔ "راجکمار ایسا کیسے چلے گا۔ تمہارے ٹورسٹ قیام کے تین مہینے تو ختم ہونے جا رہے ہیں۔ بنا کام کے اور کیسے یہاں ٹھہر سکو گے۔"

راجکمار نے پھر مظلوم نظروں سے اَرشد علی کی طرف دیکھا جیبوں میں ہاتھ ڈالا اور انہیں اُلٹنا ہی چاہتا تھا کہ

ارشد علی نے اشارے سے اُسے روک دیا۔ "ایک راستہ اور بھی ہے۔ یہیں کوئی گوری لونڈیا پھانسو اور شادی رچاؤ۔ پھر وہ خود ہی تمہیں کام کا ویزا دلوا دے گی۔"

اس کام کے لئے ارشد علی اُسے اپنے ساتھ ڈانس کلبوں میں لے جانے لگا مگر جلدی ہی اُسے معلوم ہو گیا کہ راجکمار اس معاملے میں بھی کبھی ہیرو نہیں بن سکے گا، زیرو ہی رہے گا۔ ناچنا تو در کنار راجکمار کو کسی چھوکری کو ناچ کی دعوت دینا بھی نہیں آتا تھا۔ ایک بار ارشد علی نے زبردستی اُسے ایک واقف لڑکی کے ساتھ فلور پر دھکیل دیا۔ مگر وہاں بھی وہ روس کی طرف بڑھتے جرمن فوجی کی طرح راستے میں ہی ٹھنڈا پڑ گیا اور چند ہی منٹ بعد واپس ارشد علی کے پاس آیا تو اُس کے چہرے پر پسینوں کے لیپ پر لیپ ہوتے جا رہے تھے۔ گھبرا کر اُس نے ارشد علی کے پاؤں پکڑ لئے۔

"چاچا۔ تم ہی نے درد دیا ہے تم ہی دوا دے دو۔"

"کیا مطلب؟" ارشد علی بھنا کر بولا۔

ارشد علی کو چاچا، راجکمار نے انتہائی عزت دینے کو کہا تھا۔ اُس میں اور زیادہ ملائمت بھر کر بولا۔ "چاچا تم ہی کوئی راہ نکالو۔" "تم ہی کوئی راہ نکالو۔" ارشد علی نے اُس کا منہ چڑایا۔ "لونڈیا لا کر تمہاری گود میں بٹھا دوں؟"

"تین ہفتے میں تیرہ لونڈیاں تمہارے ساتھ دیکھ چکا ہوں۔ آئی گئی رقم کی طرح آتی ہیں اور آگے چلی جاتی ہیں۔ آگے کہاں جاتی ہیں، کس کے پاس جاتی ہیں۔ تمہیں کیا معلوم اور تمہیں کیا پرواہ اُن میں سے ایک میری طرف دھکیل دو گے تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا۔" راجکمار نے پہلے ارشد علی کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگایا پھر اُس کے گھٹنے پکڑ کر اُس کے قدموں میں بیٹھتا ہوا روہانسی اور منت بھری آواز میں بولا۔ "چاچا کچھ کرو۔" چند پل اپنی ملائمت کا ردِ عمل دیکھنے کو وہ رکا، پھر سُر بدل کر اُس نے ایک لفظ اور جوڑ دیا۔ "ورنہ"

اُس کے بدلے ہوئے سُر کو پہچان کر ارشد علی نے کہا۔ "ورنہ کیا کرو گے؟"

"تمہارے دروازے پر جان دے دونگا اور ایک بے گناہ کی موت کا گناہ تمہاری گردن پر چھوڑ جاؤں گا۔" اُس نے ۔ سُر کا رُخ مظلومیت کی طرف موڑ دیا۔

اُس کا نیا پینترا ارشد علی کو بھا گیا۔ شام کو اُس نے ایک نئی بلبل کو کہا "نادان کبھی میرے یار کی منڈیر پر بھی چہچہا اور دیکھ کہ تیری آواز میں کتنا لوچ اور درد بھر جاتا ہے کہ یار مظلوم بہت ہے۔"

بلبل کو راجکمار کی آنکھوں میں پلے جیسی معصومیت نظر آئی تو اُسے بھی راجکمار بھا گیا۔ سوچا یہ فاعل کم مفعول زیادہ رہے گا۔ کئی دفعہ بیر بیری پر چڑھ کر اور کانٹے چبھوا کر توڑ کر کھانے میں خاص مزہ آتا ہے۔ "ارے اس کی آنکھیں تو راہ پوچھتی لگتی ہیں۔ اِسے تو اپنی دل پسند راہ پر لگا کر اور نمک مرچ مسالہ لگا کر کھاؤں گی۔" بلبل نے سوچا۔

بلبل سے دھتکارے جانے کے بعد راجکمار ارشد علی کے ہاں اُٹھ آیا۔ اب ارشد علی کو بھی اُسے اپنے ہاں ٹھہرانے میں کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ وہ اب کماؤ پوت ہو چکا تھا۔ ایمپلائمنٹ ایکسچینج راجکمار کو کبھی کبھی پارٹ ٹائم مزدوری کا کام دلوا دیتا تھا یا پھر بے روزگاری الاؤنس۔ راجکمار کا خرچ کیا تھا۔ صرف دو گز جگہ کی درستی اور

فرِج کے سامان سے تھوڑی سی دشمنی۔ دوستی اور دشمنی کے اس چکر میں ارشد علی کو صرف دو کام کرنے پڑتے تھے۔ ہر روز صبح کام پر جاتے وقت آنکھیں ملتے اور سوتے راجکمار کو اپنی کار میں ڈال کر ایمپلائمنٹ ایکسچینج پر گرا دینا یعنی ڈراپ کرنا اور ہفتے بھر بعد اُسکی جیبیں اُلٹ کر فرِج بھرنا اور بقایا رقم اُس کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کروانا یا کبھی کبھی کچھ رقم کا چیک بنوا کر راجکمار کے اباجان کو پوسٹ کر دینا۔

چیک پانے کے بعد راجکمار اب اباجان کی نظروں میں کھرا پیسہ بن چکا تھا اور اب وہ اس کے لئے اُداس بھی رہنے لگے تھے۔ اُن کے خط پر خط آنے لگے تھے کہ گھر آؤ، تمہیں دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔ آخر جب اُنہوں نے لکھا کہ تمہاری ماں بھی اب بیمار رہنے لگی ہے تو راجکمار سستے ٹکٹ کے چکر میں ایئر ایجنسیوں کے چکر کاٹنے لگا۔ آخر وہ وطن پہنچا۔ ماں کو دیکھا۔ باپ کے ہاتھ پر کچھ اور پیسے رکھے اور واپس لوٹ آیا مگر اُسکے واپس آنے کے چوتھے مہینے بعد اباجان کے خطوط کا پھر تانتا لگ گیا۔ "تیرے پیسوں سے پلاٹ خرید لیا ہے۔ آؤ دیکھ جاؤ اور ہمیں مل بھی جاؤ۔"

اتنی جلدی واپس جانا مشکل تھا۔ راجکمار نے ایک اور چیک بھجوا دیا۔ کچھ عرصہ بعد بُلاوے پھر آنے لگے۔

"ماں اُداس ہے۔ تمہیں دن رات یاد کرتی ہے۔ مکان بھی بنانے کا ارادہ ہے۔"

راجکمار پہنچا تو مکان کی بنیادیں کھُدنی شروع ہو چکی تھیں۔ چند روز رہ کر وہ خالی جیب لوٹ آیا۔ بُلاوؤں کی رفتار اور تیز ہو گئی تو اُس نے دو چکر اور لگا ڈالے اور جو کچھ بن سکا باپ کے ہاتھ پر رکھتا گیا۔ وہ ابھی دم بھی نہ لے پایا تھا کہ خطوط پھر تعاقب کرنے لگے۔ "مکان نامکمل ہے۔ تھوڑی سی مدد اور ہو جاتی تو چھتیں پڑ جاتیں۔"

راجکمار نے ٹکٹوں پر پیسہ برباد کرنے کی بجائے ذرا اور موٹے چیک بھیجنے شروع کر دیئے۔ اب اُدھر سے بھی خطوط میں اُسکے آنے کے بارے میں کم اور مکان کی قدم بہ قدم ترقی کے بارے میں زیادہ معلومات آنے لگیں اور کچھ اور پیسوں کی مانگ بھی۔ چوتھے اور پانچویں سال خطوط کی رفتار مدھم پڑ گئی۔ راجکمار نے اپنی زندگی کا پہلا خط لکھا۔ "مکان بن گیا ہے؟ ماں کیسی ہے؟؟" اور باپ سے ڈھیلا ڈھالا جواب آیا۔ "بس ذرا سی کسر باقی ہے۔ ماں ٹھیک ہے۔"

پہلی بار بن بُلائے یا اطلاع دیئے بغیر راجکمار شام کی فلائٹ سے گھر پہنچا۔ اب نہ صرف گھر بن چکا تھا بلکہ بھر بھی چکا تھا۔ ہر طرف رونقیں ہی رونقیں تھیں۔ چھوٹے بھائی اور بہن کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ رات دیر گئے تک شور شرابہ رہا۔ یہ سب ہنگامہ راجکمار کی آمد سے نہیں نئے لوگوں کی آمد سے تھا۔ نئی بھابی، نیا بہنوئی اور نئی......

رات کچن میں اُس کی چارپائی بچھاتے ہوئے ڈیڈی کہہ رہے تھے۔ "مکان تو تمہارا ہے مگر تم تو باہر رہتے ہو۔ دو چار دن کی بات ہے۔ تم یہیں گذارہ کر لو۔ اُدھر بازو والے کمرے میں تمہاری ماں اور اُس کے بھگوان رہتے ہیں۔ ساتھ والے کمرے میں تمہارا بھائی اور بھاوج، بیٹھک میں لڑکی اور داماد سوئیں گے اور ...... اور تم تو جانتے ہو میرا لائی نے شادی کر کے بھی اپنے پتی کو پتنی کا کوئی سُکھ نہیں دیا تھا۔ وہ سدا کرشن بھگوان کی بھگتنی بنی رہی تھی۔ تمہاری ماں بھی اِسم بامُسمّیٰ ہے۔ میں اُس سے زندگی کا کوئی بھی سُکھ حاصل نہیں کر سکا۔ کوئی کب تک ایک لاش کے ساتھ زندگی گذار سکتا ہے۔ زندگی پَل دو پَل یا دو چار دِن کا نام تو نہیں...... زندگی کے اتنے چھوٹے سے سُکھ کے لئے

میں اگلے جنم کی راہ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ پھر کون جانتا ہے کہ اگلا جنم کیسا ہوگا۔ میں نے کونسی بڑی کولی نیکیاں کمائی ہیں۔ اگلا جنم اگر مجھے کُتّے کا مِلا تو کون بھلی عورت میرے ساتھ کُتیا کی جُون لینا پسند کرے گی۔ اِس لئے میں نے سوچا کیوں نہ اِسی جنم میں...... اپنی نئی ماں سے مِلنا چاہو گے۔ اُدھر ہمارا کمرہ ہے۔ کوئی بات نہیں۔ اَب دیر ہو گئی ہے۔ صُبح مِل لینا وہ کون سی کہیں بھاگی جاتی ہے..... اور یہاں چار پیسے اور ہو جاتے تو تیرے نام کی اُوپر ایک اور سٹوری شروع کر دیتا۔"

دُوسرے دن راجکمار ایر وفلوٹ کے دفتر سے سب سے پہلے جانے والی واپسی کی فلائٹ سے سیٹ مانگ رہا تھا۔

بیوی یا بیماری

آج پھر وہی بات ہوئی تھی۔

اپنے ملک میں تو ڈاکٹر لوگ مرتے ہوئے مریض کے مُنہ میں بھی کوئی نہ کوئی دوا ٹپکا دیتے ہیں۔ کم از کم ایک اُمید تو بنتی ہے اور یہاں ــــ اُسے یاد آیا تین سال پہلے جب سردیوں میں اُس کے پاؤں سوج گئے تھے اور اُسکے لئے چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا تھا تو وہ قریبی ڈسپنسری کے ڈاکٹر کے پاس گیا تھا۔ ڈاکٹر نے بغور معائینہ کرنے کے بعد پوچھا تھا۔ "عمر؟"

"ساٹھ سال۔" اُس نے جواب دیا تھا

"پاؤں کو گرم رکھا کیجئے۔ میں آپکو کوئی دوا نہیں دیتا۔ کام سے چند دِن کے لئے آرام کا سرٹیفکیٹ لکھ دیتا ہوں۔ اِس عمر میں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہی ہے۔ یُو ہیو ٹو لِو وِد اِٹ (YOU HAVE TO LIVE WITH IT) (تمہیں اب اِن بیماریوں کے ساتھ رہنا ہے) میری فیس پچاس کرونز۔"

کچھ عرصہ بعد اسکی چھاتی میں ہلکا سا درد اُٹھا تھا۔ تب بھی ڈاکٹر نے اُسے دو ہفتے آرام کروایا تھا۔ کوئی دوا نہیں دی تھی۔ اپنی فیس کھری کی تھی اور وہی الفاظ دُہرا دیئے تھے۔ "یُو ہیو ٹو لِو وِد اِٹ۔"

پھر اُسے گھٹنوں میں درد رہنے لگا تھا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایسے لگتا جیسے ٹانگوں کی زنجیر میں گھٹنوں پر جس کڑی کا جوڑ ہے، وہ وہاں سے ٹوٹ رہی ہے اور اُس کا جسم کبھی بھی گر کر اپنے ہی قدموں میں ڈھیر ہو جائے گا۔ اُس نے ڈاکٹر بدل لیا تھا مگر دوسرے ڈاکٹر نے بھی وہی کچھ کیا اور کہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اور چھوٹی موٹی بیماریاں اُس کے جسم میں اپنا گھر بنانے لگی تھیں اور وہ تھوڑی بہت احتیاط کے ساتھ حتی الامکان اُن سے کنی کاٹتا ہوا بھی آہستہ آہستہ اپنا جسم اُنکے حوالے کرنے لگا تھا۔ ہاں ڈاکٹر کا ایک مشورہ اُسے ضرور پسند اور موافق آیا تھا۔ "ٹیک اِٹ ازی (TAKE IT EASY) (آرام سے رہو)"

اب وہ سیر پر جاتا تو آہستہ چلتا۔ جہاں بھی لِفٹ میسر ہوتی، سیڑھیاں چڑھنے سے گریز کرتا۔ وہ زندگی میں بھاگ دوڑ کی بجائے آہستہ روی لے آیا تھا۔ ایک بار اُس نے ایک ایشین فوڈ شاپ سے مٹھائی خرید کر کھا لی۔ مٹھائی تھی کہ

rekhta

زہر کی پڑیا۔ اندر جاتے ہی اُس نے اس کے سارے جسم کے خون کو بِلو کر رکھ دیا تھا وہ بڑی مُشکل سے دُکان سے گھر پہنچا تھا اور اندر داخل ہوتے ہی ڈرائنگ رُوم کے غالیچے پر قے کر دی تھی۔ قے کے بعد اُس کا جسم ایسے ہو گیا تھا جیسے سارے جسم کی ہڈیوں کو اندر ہی اندر کسی مشین نے چُور چُور کر دیا ہو اور وہ وہیں فرش پر ہی کسی آٹے کی بوری کی طرح بے جان ہو کر ڈھیر ہو گیا تھا۔ اُس کی بیوی نے فوراً اسٹرل ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کو فون کر کے ایمبولینس تک منگوالی تھی۔ ایمبولینس کے ساتھ آئے ڈاکٹر نے گہرے معائنے کے بعد اُسے ہسپتال لے جانا غیر ضروری سمجھا تھا۔ کہا تھا۔ "آپ کی عمر اب ایسی ویسی چیزیں کھانے کی نہیں ہے۔ آپکو کسی دوا کی ضرورت نہیں۔ بس چند دِن آرام کیجئے اور ہلکی خوراک لیجئے"

ساتھ ہی اُس نے اُسے دفتر سے ایک ہفتے آرام کرنے کا سرٹیفکیٹ لکھ دیا تھا۔

وہ بہت حساس انسان تھا اور زبان داں بھی۔ اُس کی گرامر بے حد مکمل اور دُرست تھی

اُس کی بیوی وہاں اپنے وطن میں ایک گورنمنٹ آفس میں سیکریٹری تھی۔ دِن میں اُسے بیسیوں ماتحتوں کو جھڑکنے کا موقعہ ملتا رہتا تھا۔ ماتحتوں کو دبا کر رکھنے کے شوق کی خوشی بھی حاصل ہوتی رہتی تھی۔ ماتحت سٹاف جب ہاتھ جوڑ کر اپنی فریادیں اُس کے حضور پیش کرتا تو وہ خود کو ملکہ نُور جہاں تصور کرتی۔ خوبصورت فرق یہ تھا کہ نُور جہاں کے فیصلے جہانگیر کے لبوں سے ادا ہوتے تھے جبکہ اُس کے فیصلے بھی اپنے تھے اور لب بھی اپنے۔ تنخواہ بھی معقول تھی مگر اب اُس کا خاوند اُسے یُورپ کے ایک ایسے مُلک میں لے آیا تھا جہاں کوئی ماتحت کسی قسم کی جھڑک برداشت نہیں کرتا تھا۔ وہاں وہ اپنی میز کی گھنٹی بجاتی تو باہر دروازے پر بیٹھا چپڑاسی "یس میڈم" کہتا بھاگا ہوا کسی حاضر جناب قسم کے جن کی طرح ہر خدمت کے لئے پیش ہو جاتا۔ کلرک طبقہ میڈم میڈم کہتا نہ تھکتا اور یہاں اُسے صرف نام سے پُکارا جاتا۔ دفتری سٹیشنری تک بھی ضرورت پڑتی تو سٹیشنری سیکشن سے خود ہی جا کر لانی پڑتی۔ یہاں سارا سٹاف سیکشن اِنچارج اور ڈائرکٹر تک کو نام سے پُکارتا۔ اُسے بھی سرکاری کاغذات وغیرہ ماتحتوں کو دینے کے لئے خود ہی اُنکے پاس آنا پڑتا۔

یہاں اُسکی نوکری تو بہت آرام دہ تھی۔ ذمہ داری صفر، کام آدھا اور تنخواہ اپنے وطن سے دس گُنا زیادہ، مگر وہ جو خوشامد سُننے کا چسکہ تھا، وہ پورا نہ ہوتا تو وہ بے چین رہتی اور اِس کا غصّہ وہ اپنے خاوند پر نکالتی۔ اُس نے خاوند کو محض ایک ڈرائیور تصور کر لیا تھا۔ جسے نہ صرف اُس کی کار ڈرائیو کرنی ہوتی تھی بلکہ خود اپنی زندگی کی گاڑی بھی اُسکی مرضی کے مطابق چلانی تھی۔ اُسے خاوند کی ذرا ذرا سی بات پر بھی غصّہ آ جاتا۔ وہ اُسے ایک بچے کی طرح بات بات پر جھڑک دیتی۔ "چُپ رہو، تمہیں کچھ پتہ نہیں"، تو اس کا تکیۂ کلام بن کر رہ گیا تھا ــــــ دُکان سے سامان خورد و نوش خریدتے ہوئے اگر خاوند اپنی پسند کی کوئی چیز خریدنا چاہتا تو وہ اُسکے ہاتھ سے چھین کر واپس ریک پر رکھ دیتی۔ "نہیں نہیں چاہیئے"

وہ کوئی رسالہ پسند کرتا تو وہ ٹوک دیتی۔ "کوئی ضرورت نہیں"

وہ کماتا تھا۔ اُسکی تنخواہ اور نوکری بیوی سے کسی طرح کم نہیں تھی مگر وہ چاہتی کہ وہ ایک پیسہ بھی اُسکی مرضی کے خلاف خرچ نہ کرے۔ وہ خود بھی کوئی خاص خرچیلا شخص نہیں تھا۔ اکثر تو ایسا بھی ہوتا کہ وہ اپنے لئے چائے کا پانی چولھے پر رکھتے ہوئے اُس سے پوچھتا۔ "چائے پیو گی؟" تو وہ تقریباً چیخ کر کہتی "کیا تمہیں چائے بُری لگتی ہے"

بطورِ اُستاد خاوند کی زبان اور گرامر سے ساری واقفیت خس خس سے بیٹھ جاتی۔ وہ سوچتا۔ اِس میں چیخنے کی کیا بات تھی۔ اور اِتنا لمبا مکالمہ بولنے کی کیا تُک تھی۔ جواب صرف ہاں یا نہ میں بھی دیا جا سکتا تھا۔

خاوند کو گھر میں کوئی رِسالہ یا کتاب نہ ملتی تو وہ پُوچھ ہی بیٹھتا۔ "کتاب کہاں ہے؟"

"کون سی کتاب؟" سوال پر سوال جڑ دیا جاتا۔ چاہے وہ کتاب ایک ہی گھنٹہ پہلے آئی ہوتی۔

"ابھی جو بازار سے خرید کر لائے ہیں۔"

"نام تو سیدھی طرح۔"

"ہندوستان ۸۹۔"

کتاب نہ دی جاتی۔ مزید سوال ہوتا۔ "کِس لئے چاہیئے؟"

"اُس میں سے ایک فِقرہ نوٹ کرنا تھا۔"

"کون سا فِقرہ؟"

"بھگت سنگھ اور راج گورُو سے متعلق تھا۔"

"کون بھگت سنگھ؟"

"ہماری جنگِ آزادی کے شہیدِ اعظم۔"

کتاب کا کوئی اَتہ پتہ نہ دیا جاتا۔ صِرف ایک نامکمل اور ادھورا سا لفظ میاں کے منہ پر پھینک دِیا جاتا۔ "پھِر....؟"

اور میاں اپنی ساری گرامر، ساری زبان دانی۔ سارا خالی جگہوں کو پُر کرو، کا اپنا زندگی بھر کا تجربہ صرف کر دیتا تو کچھ اِس قسم کے فِقرے اُس کے ذہن میں اختراع ہوتے۔

"تو پھر میں کیا کروں۔"

"پھر مجھے کیا۔"

"پھر کتاب لینے پہنچ گئے۔ ابھی تو میں نے خود بھی نہیں دیکھی۔"

خاوند ہزار کنٹرول کرنے پر بھی جھنجھلا اُٹھتا۔ اُس کے سینے میں درد کی لکیر اِس سرے سے اُس سرے تک تیر جاتی۔ سر کے اندر چھوٹے بڑے گول گول لوہے کے گولے اُچھل کُود کرنے لگتے۔ ذہن کی کوٹھری میں درد ایسے ایسے بے ڈھنگے بریک ڈانس کرتا کہ کوٹھری کی دیواریں تک ہِل کر رہ جاتیں۔ ایسا ہفتے میں دو تین بار ضرور ہوتا۔ حساس خاوند ابھی پچھلے شاک سے ہی نہ سنبھل پاتا کہ پھر کوئی اور دِل شکن بات ہو جاتی۔ وہ بیوی ہی کی بڑھتی ہوئی خواہشات کی تکمیل کے لئے اِتنی دُور سات سمندر پار آیا تھا۔ وہ سوچتا، وہ اب کیا کرے۔ حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ واپس جانے کا بھی چارہ نہیں ——— وہ جان بُوجھ کر دفتر سے لیٹ آتا تو بیوی ناراض ہوتی۔ میں اکیلے ویرانے میں پڑی سڑتی ہوں اور آپ دفتر والیوں سے چُہلیں کرتے رہتے ہیں۔ اُسے اپنے اتنے خوبصورت گھر کو بیوی سے ویرانہ کہتے سُن کر دُکھ ہوتا۔ اُس نے کتنے شوق سے اس نئے دیس میں گھر بنایا، سجایا اور سنوارا تھا گیلری اور پائیں باغ میں جو ہر سال سینکڑوں روپے کے پھُول

لگائے جاتے تھے، اُن کی ہنسی اُسے مُنہ چڑاتی اور اُس کا مذاق اُڑاتی محسوس ہوتی۔ گھر سے گھر والیوں کو زیادہ پیار ہوتا ہے مگر یہاں معاملہ برعکس تھا۔ محترمہ ہفتہ میں دوبار شام کو باہر کسی دعوت، ریستوراں یا محفل میں گذارنے کے باوجود شاکی رہتیں کہ وہ اس قید خانگی بندی ہو کر رہ گئی ہیں۔ اُسے اپنے بزرگوں کی بات کہ شرقی عورت کے قدم مرکر ہی گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ مذاق محسوس ہوتی۔

ایک بار ڈاکٹر نے اُس سے کہا تھا کہ اُسے اگر کوئی شکایت ہو تو اپنے دِل کی بات اُس سے کہہ دیا کرے، وہ بطور ڈاکٹر اور دوست اُسکے تمام راز و نیاز کی پردہ پوشی کرتا ہوا اُسکی سب شکایتوں کو اپنے تک ہی محدود رکھے گا، اِسطرح اُس کے دِل کا غبار نکل کر جی ہلکا ہو جایا کرے گا۔ ایک بار اُس نے اپنے سب گلے شکوؤں کا سارا پلندہ ڈاکٹر کے سامنے کھول دیا تھا تو ڈاکٹر نے سمجھایا تھا۔

"دیکھو بال بچے دار ہو۔ اُن کی تمام فکروں سے ضرور آزاد ہو چکے ہو مگر پھر بھی اُنکی دُوسرے رشتہ داروں، واقفوں اور دوستوں کی ہزاروں باتیں صرف بیوی سے ہی کر سکتے ہو اور وہ اُنہیں سمجھتی بھی خوب ہو گی۔ تم ایک دوسرے کو پچھلے تیس تیس چالیس چالیس سال سے سمجھتے اور جانتے ہو۔ ایک دوسرے کی عادتیں، خصلتیں، زبان، محاورے، شب و روز اور ضرورتیں۔ وہ سب اور کہاں سے پوری کرو گے تیس تیس چالیس چالیس سال اپنی لائن پر لگائی ہوئی بیوی کی جگہ اگر کسی اور کو دو، تو کیا اُسے پھر تیس تیس چالیس چالیس سال تمہیں سمجھنے میں نہیں لگیں گے اور کیا اب تمہارے پاس تیس تیس چالیس چالیس سال ہیں بھی۔ یاد رکھو کوئی گرہستی گھر دیوی دیوتاؤں کا مندر نہیں ہوتا!"

اُسے اپنی بدمست اور البیلی جوانی کے وہ دن یاد آتے جب حسینائیں اُسکی طرف دیکھتی رہ جاتی تھیں۔ اب جوان عورتیں اُسے انکل کہہ کر اُسکی سب اُمیدوں پر پانی پھیر دیتیں۔ ادھیڑ اُسے بزرگوار اور ہم عمر بھائی صاحب سے مخاطب کرتیں۔ دُوسرے معنوں میں اب باہر کی عورتوں کے ساتھ اُس کا رشتہ انکل، بزرگوار یا بھائی صاحب کا رہ گیا تھا۔ اُن میں کوئی بھی اُسے دوست تک کہنے کی روادار نہ ہوتی تو اُسے ساری دُنیا میں ایک ہی عورت ایسی نظر آتی جسے وہ محبُوبہ، بیوی اور قریب ترین میسر عورت محسوس کر سکتا تھا۔

اب اُس نے ہم کلامی اور اپنا دُکھڑا رونے کے لئے گھر میں ہی ایک دوست نما ڈاکٹر تلاش کر لیا تھا، جو کوئی فیس تک بھی چارج نہیں کرتا تھا۔ وہ بیوی کی ہر زیادتی کے بعد اپنے الگ سے ریڈنگ رُوم میں بند ہو کر قدِ آدم آیئنے کے سامنے جا کھڑا ہوتا، جو چُپ چاپ اُس کے سب شکوے سُننے کے بعد بڑے ہی شانت لہجے میں اپنی زبانِ خاموش سے سمجھا دیتا۔ "یو ہیو ٹو لِو وِد اِٹ"!

جھوٹ + جھوٹ = سچ

وہ ابھی ابھی رشن تال سے نکلے تھے۔ ہال میں پرتاپ اور پریہ پوار نے اپنے کتھک اور اڈیسی ناچوں کے کمالات دکھائے تھے۔ میاں بیوی دونوں رقص کی دُنیا کے نامور ستارے ہیں جنھوں نے بھارت سے باہر بھی بڑا نام اور دھن کمایا ہے۔ حاضرین نے تالیوں کی گڑگڑاہٹ اور واہ واہ کے شور سے اُن کی خوب قدر افزائی کی تھی جبکہ ملیحہ اور سلیم دو گھنٹے کے تمام عرصہ میں کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے مُسکراتے اور شرماتے رہے تھے۔ شرمانے کا عمل عورت کی ڈیوٹی میں شامل ہے مگر اُس کی شرمانے کی اَداؤں میں بھی ایک خاص بات ہوتی ہے اور ایک خفیہ اشارہ' جسے مرد پالیتا ہے تو پھر اُسے بھی پالیتا ہے۔ چُوک جاتا ہے تو پھر مال پرایا ہو جاتا ہے۔

ناروے کے اِس بڑے شہر اوسلو میں پروگرام ختم ہوتے ہی لوگ گھروں کو نہیں چلے جاتے۔ جب بھی یہاں رقص و موسیقی یا شعر و شاعری کی کوئی محفل جمتی ہے تو لوگ بعد میں رُکتے اور کافی دیر تک باتیں کرتے رہتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ یا اسی قسم کے دوسرے پروگرام لوگوں کے مُدتوں بعد ملنے کا پلیٹ فارم بنتے ہیں ورنہ یورپ کی تیز رفتار زندگی اور دولت کے پیچھے دوڑ قریبی دوستوں تک کو بھی دِن بدن ایک دوسرے سے دُور لئے جاتی ہے۔

باہر آتے ہی ملیحہ نے پھر ایک مُسکراہٹ اُس کی طرف پھینکی ہے۔ اُس کے ساتھ اُس کے ماں باپ بھی ہیں۔ وہ سلیم کو جانتے ہیں مگر اُس کے دِل کی بات سے لاعلم ہیں۔ ملیحہ کے والد اور سلیم اکثر لائبریری میں ملتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی اخبارات اور رسائل کا تبادلہ اُن میں دو باتیں بھی کروا دیتا ہے۔ اپنے والد کے بیمار ہونے پر ملیحہ ایک بار ایک خاص کتاب ان کے لئے لینے سلیم کے پاس آ چکی ہے۔ بس یہی اُن کی پہلی مختصر سی جان پہچان ہے۔

رقص کے شو کے بعد اور لوگ بھی جن میں ذرا سی بھی کبھی علیک سلیک رہی ہے۔ اب ایسے ایک دوسرے کے قریب آکر حال چال پوچھ رہے ہیں جیسے اُن میں بڑی پُرانی واقفیتیں اور دوستیاں رہی ہوں۔ نئی دوستیاں لگ رہی ہیں، پُرسانیوں کی تجدید ہو رہی ہے۔ یہیں کہیں عشق کی کونپلیں بھی پھوٹیں گی۔ ملاقاتوں کے وعدے بھی ہوں گے اور اِن ہی پُلوں کے ذریعے بڑے بڑے بیوپار ساگروں سے بھی پار اُتر لیا جائے گا۔

rekhta

"سلیم صاحب۔ سلام" یہ تو جیسے شاعری ہو گئی۔ یہ سوچ کر ملیحہ کے والد لبوں میں ہی مسکرا دیئے ہیں۔

"وحید صاحب۔ وعلیکم اسلام" اُس نے بھی ایک طرح سے سلام کا جواب شاعری میں دیا ہے اور مسکرایا ہے۔

یہ س س اور و۔ و کا استعمال تک بندی ہی سہی مگر قریب آنے اور لانے کا ایک بہانہ بھی تو ہے۔ دراصل ایسے پروگراموں کے بعد لوگ ایک خاص موڈ میں ہوتے اور گھل جاتے ہیں۔ یہ چہچہاہٹ وقتی بھی ہوتی ہے مگر اِس کی تہہ میں کبھی کبھی بڑے طوفان بھی مچل اُٹھتے ہیں۔

"سلیم صاحب۔ لگتا ہے۔ آپ کو کتھک اور اوڈیسی کی زبردست پہچان ہے" ملیحہ نے اُس کے قریب آ کر کہا: "سچ آپ بہت محوم ہے تھے"

"تو کیا آپ رقص کم اور مجھے زیادہ دیکھ رہی تھیں" سلیم مسکرائے۔ یورپ میں رہ کر ماں باپ اتنے فراخ دِل تو ضرور ہو جاتے ہیں کہ اُن کی لڑکی سے کوئی ایسا ہلکا پھلکا مذاق کرے تو وہ ہنس کر ٹال جائیں جبکہ پہل اُن کے سامنے اُن ہی کی لڑکی کی جانب سے ہوئی ہو۔

"اِس کا بھید میں آپ کے کان میں بتاؤں گا۔ گورو کی ہدایت ہے کہ راز کی بات صرف کسی قدردان کو ہی بتانی چاہیئے" سلیم نے مسکرا کر کہا اور لڑکی یا اُس کے ماں باپ کو ذرا سا بھی موقعہ دئے یا پرواہ کئے بغیر اس کی طرف بڑھ کر اور اُس کے کان کے پاس مُنہ لے جا کر آہستہ سے کہہ دیا۔

"ملیحہ۔ تم بہت حسین ہو۔ اور میری اِس بات میں آج کے رقص جیسا سچ پنہاں ہے ـــ ارے ارے سنبھلو۔ تمہارے چہرے کا رنگ بدل رہا ہے۔ اور تمہارے ماں باپ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں۔ مسکراؤ کہ انہیں لگے، میں نے کوئی بڑی دلچسپ بات کہہ دی ہے ورنہ اُن کا دِل ٹوٹ جائے گا اور ان کے چہروں سے مسکراہٹ کا نور غائب ہو جائے گا۔ ایمان سے بڑے پتے کی بات کہہ رہا ہوں جو میں کسی خاص اپنے پیارے سے ہی کہہ سکتا ہوں۔ میری بات اچھی نہ لگی ہو تو کل تمہیں ٹیلی فون کر کے معافی مانگ لوں گا مگر اَب مسکراؤ اور مجھ سے یہ فقرہ کہو۔ آپ کو تو بھارتی رقصوں کا بہت علم ہے"

وقتی طور پر سلیم کی بات اُسے جچ گئی یا شاید خود ماں باپ کے سامنے وہ تماشہ نہیں بننا چاہتی تھی۔ وہ مسکرائی اور بولی۔

"سلیم صاحب۔ آپ تو بھارتی رقصوں کی گہری جانکاری رکھتے ہیں"

"تو یہ کان میں بتانے والی بات تو نہیں تھی" وحید احمد نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

"دیکھیئے وحید صاحب۔ بات یہ ہے کہ گورو دکشنا ادا کئے بنا تو اتنے بڑے فن کی آگاہی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ انہوں نے تو دعوت کا وعدہ کر لیا ہے۔ بتایئے آپ کیا پیش کریں گے"

"تو آپ ہمارے ہاں دعوت پر آ رہے ہیں۔ جام و مینا میں پیش کرونگا"

"خوب۔ پھر تو مجھے ہندوستان کے چاروں بڑے رقصوں پر لیکچر دینے ہوں گے۔ خیر مجھے منظور ہے ـــ آپکا ایڈریس اور فون نمبر" وہ ملیحہ کی طرف مڑا۔ وہ دراصل اُس کے ہاتھ کی تحریر حاصل کرنا چاہتا تھا ملیحہ نے پتہ اور

فون نمبر لکھ دیا۔

"فون کیجئے گا۔ ویسے کون سا دِن آپ کو سُوٹ کرے گا؟" ملیحہ نے پوچھا۔

"جو بھی آپکو پسند ہو" وہ تو جلدی سے جلدی اُس کے قریب آنا چاہتا تھا۔ "خیر میں فون کرکے بتا دونگا۔"

تیسرے دِن اُس نے دوپہر کو فون کیا۔ اُسے معلوم تھا اُس وقت ملیحہ گھر پر نہیں ہوگی اور ابا میاں خود ہی اُسکے دفتر کا فون نمبر دے دیں گے۔ یہی ہُوا۔ انہوں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ملیحہ کے دفتر کا نمبر دیتے ہوئے کہا: "اُس سے وقت مقرر کرلیں۔ ہم تو گھر کے بندے ہیں۔"

آخری فقرے سے مطلب تو اُن کا یہ تھا کہ وہ ہر وقت گھر پر ہی ہوتے ہیں مگر گھر کے بندے کے الفاظ کا اُن پر بالکل ٹھیک اِطلاق ہوتا تھا کیونکہ بیٹی ہی کماتی اور گھر کو چلاتی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی تو انڈیا سے ریٹائرمنٹ کے بعد اُس پر ڈی پینڈنٹ ہو کر آئے تھے۔ انڈیا میں آپ لاکھوں پتی ہیں اور شریف ہیں تو آپ کچھ زیادہ پیسہ باہر نہیں لا سکتے۔ اور وہ تو تقریباً خالی ہاتھ اپنی ڈال سے ٹوٹی بیٹی کے پاس آئے تھے۔

اب ڈال سے ٹوٹی بیٹی کی کہانی کچھ اِس طرح ہے کہ اُس نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی۔ پہلی نظر کا تیر تھا جو لگا۔ اُدھر تو دوسری طرف نکل گیا مگر ملیحہ اُسے دِل میں ترازو کئے احساس کی دُنیا میں ساتھ ساتھ لئے پھرتی رہی اور موقعہ ملتے ہی سب رشتے ناطے ٹھکرا کر اپنے مَن بھاون کے پاس ناروے پہنچ گئی۔ وہاں اُس نے ٹیچنگ کورس کیا ہوا تھا۔ ناروے میں اُسے ٹیچنگ کی ہی مناسب سی جاب مل گئی۔ میاں مسعود احمد کسی فیکٹری میں ملازم تھے۔ یہاں چوبیس گھنٹے مزدوروں والی ڈانگری میں ملبُوس رہتے۔ ہاں مُلک جاتے تو سج دھج اَور ہوتی۔ لاپی ڈس کا ڈبل لشکارے مارتا سُوٹ، ٹائی اور کالی عینک اُنہیں اور بھی نوجوان بنا دیتی۔ کئی کئی سال ایک بھی پیسہ نہ خرچتے مگر وطن جاتے تو کسی دُلہن کی اَمیر ماں کی طرح دِل کھول کر شاپنگ کرتے اور تحفے تحائف سے لد کر جاتے۔ ہاں ہفتہ دس دِن میں جب خُون سا گرمی میں مدوجزر اُٹھتا تو کسی ڈانس بار میں پہنچ کر اپنی جیسی کسی بھُوکی پیاسی لڑکی کو گھیر لاتے اَور پھر چند منٹوں کے لئے دو منفیاں مل کر مثبت بن جائیں اور پھر بدستور اپنی اپنی راہ لیتیں۔

ملیحہ آئی تو مسعود احمد نے چاہا۔ وہ بھی اُسکے ساتھ یورپین لوائے فرینڈ، گرل فرینڈ کی طرح ٹرائیل پیریڈ جیسا وقت گذارے۔ دونوں کا دِل ملنے تو شادی کے بندھن میں بندھ جائیں ورنہ ایسے ہی چلتا رہے۔ بچے بھی ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں مگر حتیٰ الامکان ایک دوسرے کے پاؤں کی بیڑی بننے سے گریز کیا جائے۔ ہاں کبھی بہت ہی تمنا سہرا باندھنے اور دُلہن بننے کی تنگ کرے تو اپنے ہی بچوں کی برات کے ساتھ شادی کا ڈھونگ بھی رچالیا جائے مگر ملیحہ تو ہر مشرقی لڑکی کی طرح بہت سے خواب سجا کر آئی تھی۔ یہاں تو پہلا ہی خواب مرد کے گھوڑے پر سوار دُولہا بن کر آنے اور اُسے لے جانے کا تباہ ہوا جاتا تھا۔ جھُوٹے وعدے وعید کے چند ماہ بعد ہی جب ملیحہ نے دیکھ لیا کہ اِن تلوں میں تیل نہیں تو اُس نے مسعود میاں کو دھتا بتا دیا اور اپنی الگ راہ پکڑ لی۔

ماں باپ کو اُن کے جھوٹ چھلاوے کا پتہ چلا تو وہ بہت تڑپے۔ وحید احمد کے ریٹائر ہونے سے پہلے باہر

نکل سکنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔ آئے تو نئے ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہونا مشکل کہاں اپنے جیسے ہم خیال ڈھونڈھے تلاش کرتے بس ایسی ہی کسی محفل میں مل لیا۔ چند فقرے اپنی زبان و تہذیب کے بول لئے تو سرور رہا، اُترا تو پھر وہی پردیس کا لق و دق صحرا۔ دل سے چاہتے تھے کہ لڑکی کسی ٹھکانے لگے یا اُن کے ساتھ واپس چلے تو وہ بھی جلی ہوئی کشتیوں پر پھر سے بھروسہ کرکے واپس چل چلیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہیں سلیم کی آزادروی اور کھلے مگر شائستہ قسم کے پُر مزاح الفاظ بُرے نہیں لگے۔ اپنے ہاں تو شادی سے پہلے وہ اپنی لڑکی کا پاؤں تک بھی دکھانا ناپسند کرتے۔ یہاں معاملہ دوسرا تھا، حالات دوسرے تھے۔ وہ چاہتے تھے کشتی منجدھارے نکلے اور کسی کنارے لگے۔

مقررہ دن سلیم اُن کے گھر پہنچا تو دستور کے مطابق اُن کے لئے تازہ گلاب کے پھولوں کا گلدستہ بھی تحفتاً اُس کے ہاتھ میں تھا، جو اُس نے بڑھ کر ملیحہ کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ گلاب کے پھول تو محبوبہ کو پیش کئے جاتے ہیں۔ بوڑھے ماں باپ تو نہیں مگر ملیحہ اشارہ سمجھ گئی مگر جان بوجھ کر انجان بنی رہی۔ کھانا کھانے کے بعد وحید صاحب بولے۔ "سلیم صاحب۔ وہ رقصوں پر آپکا لیکچر؟"

"وہ تو دراصل آپ سے ملنے کا بہانہ تھا وحید صاحب۔ مجھے ہندوستانی رقصوں کا زیادہ علم نہیں، ہاں میرے پاس ایک اور فن ہے۔ فنِ افسانہ نگاری کہئیے تو پیش کروں" اور اُس نے اپنا تازہ افسانوی مجموعہ اُن کے سامنے رکھدیا۔ دِل، دماغ اور دُنیا"

"نام تو اچھا ہے۔ آپکو کیسے سُوجھا؟"

"جی بس، ایسے ہی۔ وہ دراصل ایک پُرانا فلمی گیت ہے ؎

ایسی ادا تھی جس سے آنکھیں ہوئی دیوانی
یہ دِل، دماغ، دُنیا سب بن گئے کہانی

یورپ کی اداؤں نے اپنے لوگوں کو کچھ ایسا دیوانہ بنا دیا ہے کہ اُن کے دل، دماغ اور دُنیا سب کہانیاں سی بن کر رہ گئے ہیں حتیٰ کہ اُن کے دِل اور دماغ میں اپنے مذہب اور تہذیب تک نے معنی بدل لئے ہیں۔ میں اُن ہی کی کہانیاں لکھتا ہوں۔ یہ اُن کا مجموعہ ہے۔

"واہ واہ۔ کیا بات پیدا کی ہے" وحید صاحب بولے۔ "آپکو معلوم ہے ملیحہ بھی لکھتی ہے۔ ایک کہانی ابھی کل ہی مکمل کی ہے مگر ابھی اُسے خود پر اعتماد نہیں اِس لئے چھپاتی پھرتی ہے۔ آپ ایک نظر دیکھ لیں تو اُس کی حوصلہ افزائی ہو"

"ابو رہنے دیں نا۔ کہاں آتا ہے مجھے لکھنا"

"بیٹی دِکھا دو۔ سلیم صاحب دُرستی کر دیں گے تو کہیں شائع بھی ہو جائے گی۔

"ہاں ہاں ضرور دِکھائیے۔ اچھی ہوئی تو کسی اَدبی رسالے کو بھجوا دونگا" سلیم نے پیش کش کی۔

"نہیں سلیم صاحب۔ ابو تو ایسے ہی کہتے ہیں۔ رہنے دیں، مجھے نہیں آتا لکھنا وِکھنا"

دوسرے دِن وحید صاحب خود ہی ملیحہ کی کہانی چُپ چاپ اُسے لائبریری میں پہنچا گئے۔ سلیم نے پڑھی تو چونک

اُٹھا، لگا جیسے ملیحہ کی اپنی ہی زندگی کی بے شمار تکلیفوں اور تصویروں کی ایک قاش تھی اُس نے محبت کی تھی مگر دوسری طرف سے اُس کی سچی محبت کا استحصال کیا گیا تھا۔ شاید اگلے کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ایک خوشبودار، خوبصورت، شوخ اور تازہ پھول اُس کی جھولی میں آگرا۔ اتھا جسے چھاتی کے پاس کاج میں جگہ دینے کی ضرورت تھی۔

سلیم نے کہانی کی فوٹو کاپی رکھ کر اور بجنل وحید صاحب کو لوٹا دی اور کہا کہ ملیحہ کو اس بارے میں کچھ نہ بتائیں۔ دو دِن میں ہی ضروری دُرستی اور معمولی رد و بدل کے بعد کہانی کسی اچھے سے رسالے کو بھیج دی گئی۔ کہانی اچھی تھی اور مُصنفہ ایک لڑکی۔ مدیر نے اُسے دو ماہ بعد چھپنے والے افسانہ نمبر میں شامل کر لیا۔

سلیم جب رسالہ لئے اُنکے ہاں پہنچا تو اُس کے پیروں میں پنکھ لگ چکے تھے جو اُسے اُڑائے پھرتے تھے۔ وہ اس قدر خوش تھا جیسے ملیحہ کی نہیں، خود اُس کی اپنی پہلی تخلیق اِتنے اہتمام سے اتنے بڑے رسالے نے شائع کی ہو۔

اَب ملیحہ کی جھجک ختم ہو چکی تھی اور وہ بڑے خوبصورت افسانے لکھنے لگی تھی، جنہیں سُنانے کی چاہ میں وہ خود ہی سلیم کے ہاں پہنچ جاتی۔

لڑکی نزدیک جا رہی تھی لڑکا قریب آ رہا تھا اور بُڑھاپا خود اُنکے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ ماں باپ نے نظر انداز کرنا شروع کر دیا اور دو جوان دِل ملنے اور قریب آنے لگے۔ ملیحہ اُردو اَدب کی دیوانی تھی اور سلیم لائبریری میں کام کرتا تھا لائبریری اُنہیں ملانے کا کام اگر سلیم نے لائبریری میں کام کرنے کی وجہ سے تھوڑی بہت ہندی بھی سیکھ لی تھی۔ ایک دِن بولا، "ملیحہ تمہیں اُردو کے معنی بھی آتے ہیں ؟"

"ہاں" وہ بولی۔ "اُردو پڑھتے پڑھتے اور آپ کی مہربانی سے اِتنا تو جان گئی ہوں کہ اُردو یعنی لشکر گاہ۔ لشکری زبان"

"ہندی میں اُر دِل کو کہتے ہیں" وہ بتانے لگا۔ "اور دو کے معنی تو سب کو آتے ہیں۔ اُردو یعنی دو دِل۔ میں تو اُردو کو دو دِلوں کے ملانے والی زبان کہتا ہوں" اور ساتھ ہی وہ ملیحہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُن گہری جھیلوں میں اپنا ڈوبتا اُبھرتا دِل تلاش کرنے لگا۔ وہ خاموش رہی تو وہ بولا۔ "میں اِس زبان کا ہزار بار شکر گذار ہوں جو مجھے تمہارے قریب لے آئی ہے"

ایک دِن وہ اُسے ملنے آئی تو سٹاف کینٹین بند ہو چکی تھی اور آفس کا سارا عملہ جا چکا تھا۔ سلیم نے اپنی میز کی دراز سے فروٹ کیک اور بسکٹ نکالے اور ایک خوبصورت سی پلیٹ میں سجا کر میز پر رکھ دیئے اور کافی مگ پر اپنے اور ملیحہ کے لئے چائے بنانے لگا۔ ملیحہ ہنس کر بولی۔

"تمہاری دراز تو کوئی جادوئی قلعہ لگتی ہے کھلتا ہے اور جادوئی جن قسم قسم کی قابیں سجائے حاضر ہو جاتا ہے"

"تو کیا میں تمہیں جن نظر آتا ہوں" وہ کھِلکھلا کر ہنسنے لگا۔

وہ بھی ہنسنے لگی۔ پھر خوشامدانہ بولی۔ "جن نہیں شہزادہ۔ کیا میں جان سکتی ہوں اُدھر دوسری دراز میں کیا ہے ؟"

"جو کچھ ہے تمہیں شہزادی بنانے کے لئے کافی ہے۔ دیکھنا چاہو گی ؟"

"ضرور"

وہ خاموشی سے دراز کی طرف دیکھتی رہی۔ بے قراری کہ آخر اُس جادو کے پٹارے میں اور کیا ہو سکتا ہے۔ سلیم نے

دراز کھولی تو خوبصورت سی مخملی ڈبیہ میں چاندی کی پازیبیں پڑی تھیں۔ اُس نے ڈبیہ ملیحہ کی طرف بڑھا دی۔

"بس۔ بہت شور سنتے تھے ..... " ملیحہ مسکرائی۔

"پہلے میرے دِل پر ہاتھ رکھ کر دھڑکن سنو، پھر اگلی چیز دِکھاؤں گا" سلیم نے دوسری دراز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اُس میں کیا ہے؟" ملیحہ نے پوچھا۔

سلیم نے اگلا خانہ کھول کر ایک اور خوبصورت سی ڈبیہ اُسکے سامنے رکھ دی۔ اُس میں نیلم جڑی ایک خوبصورت سی سونے کی انگوٹھی پڑی تھی۔

"سچ سچ بتانا۔ یہ سب کب لائے؟" ملیحہ کے سوال میں کِس کے لئے؟ کا سوال بھی پنہاں تھا۔

"سچ سچ بتاؤں گا۔ پچھلے پانچ سال سے اِن ہی درازوں میں پڑی تھیں۔ کوئی ایسی اُنگلی نہ مِل سکی جو اِس کے قابل ہوتی، کوئی ایسے پاؤں نہ مِلے، جنہیں پہنانے کو دِل مانتا۔ انہیں تمہارے ہاتھوں میں دیکھ کر اَب خوش ہوں کہ حق بہ حقدار رسید"

"میں آپ سے جھوٹ بولتی رہی کہ میں کنواری ہوں"

"میں بھی تم سے جھوٹ بولتا رہا کہ میں نے آج تک کسی لڑکی کو ہاتھ نہیں لگایا"

پسِ دیوار

کل اُن کے قبیلے میں شادی ہوئی تھی۔ رات دیر گئے تک خوب رونق میلہ رہا تھا۔ صبح سب تھکے ماندے گہری نیند میں غلطاں پڑے تھے۔ بجدات کو جلدی سو گیا تھا اس لیے صبح اُس کی آنکھ جلدی کھل گئی۔ ذخیرے کے درختوں پر چاروں طرف سناٹا تھا۔ ترنگ کی لہر میں وہ ذخیرے کے سارے درختوں پر اِدھر اُدھر کودتا پھاندتا پھرا۔ ذخیرے کے بیسیوں درختوں پر سب پناہی راج تھا۔ جہاں چاہو جاؤ۔ جدھر دل چاہے کھیلو۔ درختوں کے پھل کھاؤ، ٹہنی ٹہنی پتہ پتہ کودو پھاندو، کوئی ممانعت نہیں تھی۔ ہاں بڑے باپو نے کہا تھا۔ تین کھونٹ گھومو، موج کرو مگر چوتھے کھونٹ مت جانا۔ اُس نے سوچا۔ چوتھی طرف ضرور کوئی خاص بات ہوگی جو بڑے باپو اُدھر جانے کو روکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے خود چھپ چھپ کر اُدھر جاتے ہوں اور صرف ہمیں ہی منع کرتے ہوں۔ اب سب سو رہے ہیں اگر میں چوتھی طرف ایک جھلک دیکھ بھی لوں گا تو کسی کو کیا پتہ چلے گا۔ تین اطراف تو ہزاروں بار دیکھ چکا ہوں۔ ایک طرف تو ہماری ہی شکل کے کسی دیوتا کا پوجا گھر ہے۔ ہم اُدھر جاتے ہیں تو لوگ ہمیں بڑے پیارے دیکھتے ہیں۔ اس کے صحن میں ہم گھنٹوں کھیلتے رہتے ہیں۔ کوئی کچھ نہیں کہتا۔ اُلٹا لوگ کھانے کو بھی کچھ نہ کچھ ڈالتے ہی رہتے ہیں۔ دوسری طرف قصبے کا چھوٹا سا بازار ہے۔ جہاں انواع و اقسام کی چیزیں بکتی ہیں۔ پوجا گھر کی قریبی تین چار دکانوں پر مٹھائی اور پھول بکتے ہیں ہم میں سے کوئی ایک آدھ دانہ مٹھائی کا اُٹھا لیتا ہے تو دکاندار اوّل تو نظر انداز کرتے ہیں ورنہ بس ذرا ہاتھ لہرا کر ہمیں بھگا دیتے ہیں ایک بار ایک دکاندار نے ہمارے ایک بھائی کو چھڑی مار دی تھی تو قصبے کے سب لوگ اس سے ناراض ہوگئے تھے اور چاہتے تھے کہ اس کی دکان بند کروا کے اُسے قصبہ بدر کر دیں کہ اس نے معافیاں مانگ کر اور آئندہ ہم پر ہاتھ نہ اُٹھانے کا وعدہ کر کے ہی بڑی مشکل سے جان چھڑائی تھی۔ تیسری طرف کچھ لوگوں کے گھر ہیں۔ جدھر ہم کبھی کبھی مٹرگشت کرنے نکل جاتے ہیں تو لوگ ہمیں کچھ بھی نہیں کہتے۔ ہاں ہمارا اُن کا ایک آدھ کپڑا پھاڑ دینا انہیں بالکل نہیں بھاتا۔ باپو نے اس سلسلے میں بھی منع کیا ہے کہ خواہ مخواہ کسی کا نقصان کرنے کا کیا فائدہ؟ اپنی بنی بنائی عزت خراب ہوتی ہے مگر ہم کیا کریں۔ جوانی چڑھتے دانتوں میں کھجلاہٹ ہوتی ہے تو کپڑے کی ملائم سطح دانتوں کو بہت اچھی لگتی ہے۔ خیر باپو کے رعب اور سمجھانے سے

rekhta

یہ غلطی بھی ہم سے کم ہی سرزد ہوتی ہے۔

سب سو رہے ہیں۔ چوتھی طرف جھانک لینے میں کیا حرج ہے جب تک سب اُٹھیں گے میں واپس آچکا ہوں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوگی۔

ارے ادھر بھی کوئی خاص بات نہیں۔ بجو نے دیکھا۔ چند گھر ہیں اور ان کے کوٹھے ہیں۔ جن کی چھتوں پر لوگ صبح کی گہری نیند میں ڈوبے سو رہے ہیں۔ ذخیرے کے درختوں کے ساتھ لگتے چوبارے کی چھت پر ایک نوجوان لڑکا سو رہا ہے۔ اب وہ آنکھیں ملتا اُٹھ بیٹھا ہے۔ میں رُکوں یا بھاگ جاؤں۔ میں اس سے کافی دور ہوں۔ بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیکھتا ہوں کہ ادھر دیکھنے لائق اور کیا ہے۔ لڑکے نے مجھے دیکھ لیا ہے ارے وہ تو میری طرف اشارے بھی کر رہا ہے۔ جیسے مجھے پاس بُلانا چاہتا ہو مگر ساتھ ساتھ جانے وہ عجیب و غریب شکلیں بنا بنا کر ہنس کیوں رہا ہے۔ میں کوئی ہنسنے کی چیز ہوں ــــــ اس نے اپنی جیب سے کچھ بھُنے ہوئے چنے نکال کر چھت پر بکھیر دیے ہیں۔ یہ سب مجھے پھنسانے کی چالیں ہیں۔ نہ بابا مجھ بالنٹورا ہی بھلا۔ باپو نے اِدھر آنے کو منع کر رکھا ہے۔ بس یہی کافی ہے کہ میں اِدھر چلا آیا ہیں چلا۔

دوسرے دن موقع پا کر بجو پھر اِدھر چلا آیا۔ لڑکے کی عجیب و غریب شکلیں بنانا اُسے اچھا لگا تھا۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ وہ عین اس وقت ادھر آیا تھا جب لڑکا ابھی ابھی جاگا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ پھر بہت خوش ہوا اور اُسے پھر اشاروں اشاروں میں اپنے پاس بلانے لگا۔ بجو اسے دُور دُور سے ہی نظریں گھما گھما کر دیکھتا رہا۔ آج اس نے کوئی سفید سی مٹھائی چوبارے کی دیوار پر رکھ دی، شاید برفی تھی۔ بجو کو برفی بہت پسند تھی۔ وہ ٹھنی ٹھنی پتہ پتہ دیوار کے قریب پہنچا۔ لڑکا اسے موقع دیتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے جھپٹ کر مٹھائی اُٹھائی اور واپس اپنی ڈال پر لوٹ آیا اور غڑپ غڑاپ ساری مٹھائی پوٹے میں بھر لی۔ لڑکے نے پھر بہت سے چنے چھت پر بکھیر دئے۔ بجو واپس لوٹنے لگا تو دیکھا لڑکا بہت دُور کھڑا تھا۔ وہ رُک گیا اور دونوں ہاتھوں سے سارے چنے بھی چُن چُن کر پوٹا بھرنے لگا۔ لڑکا دور کونے میں کھڑا دیکھتا رہا۔ جب وہ سارے چنے ختم کر چکا تو لڑکے نے برفی نکال کر ہتھیلی پر رکھ دی۔ بجو آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور اس کی ہتھیلی سے برفی اٹھا کر واپس دیوار پر لوٹ آیا۔ لڑکے نے ایک اور ٹکڑا نکالا اور ہتھیلی پر رکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا وہ پھر آگے بڑھا۔ مگر ڈر کر واپس لوٹ آیا لڑکے نے برفی اس کی طرف پھینک دی۔

آہستہ آہستہ اُن میں دوستی ہوگئی۔ اب وہ آرام سے لڑکے کی چارپائی پر اس کے پاس جا بیٹھتا۔ اس کے ہاتھ سے چیزیں کھا لیتا۔ لڑکا جو کچھ کھاتا اُسے بھی ضرور کھلاتا۔ بجو وقت بے وقت جب چاہتا، بزرگوں کی نظر بچا کر اُدھر پہنچ جاتا اور گھنٹوں لڑکے کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ اب لڑکا اسے کندھے پر بٹھا کر شہر بھی لے جانے لگا تھا۔ جہاں لڑکے کے دوسرے دوست بھی اس کے ساتھ بہت پیار سے پیش آتے تھے اور کھانے کو بھی کچھ نہ کچھ دیتے رہتے تھے۔

ذخیرے کے بزرگوں کو شک ہوگیا تھا کہ بجو اکثر اپنے ذخیرے سے غائب ہو کر علاقہ غیر میں پہنچ جاتا ہے اس لیے بجو نے کچھ دن اُدھر جانے کا خیال ترک کر دیا تاکہ اس کا وشواس پھر سے قائم ہو سکے۔ آخر پانچ چھ دن کے صبر آزما انتظار کے بعد وہ پھر اُدھر پہونچ گیا۔ اُسے ڈر تھا کہ لڑکا اس کی اتنی طویل غیر حاضری پر ضرور ناراض ہوگا مگر نہیں لڑکے نے اسے

پہلے ہی دن جیسا پیار دیا اور کندھے پر بٹھا کر پھر گھمانے پھرانے لے گیا۔ ہاں اس بار اس نے یہ ضرور کیا کہ بجو کے گلے میں ایک پٹہ اور رسی ڈال دی۔ بجو بھی اب اس کے ساتھ کا عادی ہو گیا تھا ویسے لڑکا اس کا خیال بھی بہت رکھتا تھا یا شاید اس شہر کی ریت ہی پریت کی تھی کہ بجو نے بڑی خوشی سے تھوڑی سی پابندی برداشت کر کے اس کے ساتھ رہنا قبول کر لیا۔ اسے ذخیرے کے ساتھی یاد تو آتے مگر یہاں کا آرام اور خلوص بھی اچھا لگتا۔ وہ سوچتا چڑیوں کے بچوں کو بھی پر لگتے ہیں تو ماں باپ کو چھوڑ کر اپنی راہ اُڑ جاتے ہیں۔ اگر وہ یہاں چلا آیا تو کیا خاص بات ہوئی اور وہ اب لڑکے کے ساتھ ہی رہنے لگا۔

کچھ دن بعد نجانے لڑکے کو اس شہر کی کیا ادا اکھر گئی کہ اس نے اس شہر کو چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ اصل میں کچھ لوگوں کو زیادہ آزادی راس نہیں آتی اور یہاں اپنا راج تھا۔ چاہو تو راجہ کو رکھو چاہو تو اسے ہٹا کر دوسرے کو تخت پر بٹھا دو۔ دور کے ڈھول سہانے اور نئے تجربے کے خیال سے وہ بجو کو کندھے پر بٹھا کر پڑوس نگری پہنچ گیا۔ اس نے سوچا۔ وہاں دُودھ کی ندیاں بہتی ہوں گی۔ کیونکہ اُدھر سے جو بھی آتا تھا دولت کی ریل پیل کی ہی بات کرتا تھا۔ اس نے سوچا وہ بھی کیوں نہ نئے نگر جا کر بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے مگر وہاں جا کر اُسے پتہ چلا کہ واقعی وہاں دولت کی ندی تو بہتی تھی مگر وہ گنتی کے چند ہی گھروں کے کناروں کو چھو کر گذرتی تھی یا صرف ان لوگوں پر مہربان ہوتی تھی جو وہاں کے بادشاہ سلامت کی بُرش جیسی مُونچھوں اور شاہانہ چمک دمک پر رُطب اللسان رہتے تھے۔ لڑکا تھا تو سمجھدار مگر اس کے ذہن میں اُن خوشامدانہ تعریفی الفاظ کا ذخیرہ بہت کم یا شاید نہ کے برابر تھا جس سے بادشاہ لوگ خوش ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ نئے نگر میں زیادہ دن نہ چل سکا اور بھوکا مرنے لگا۔ ایک دن اس نے بجو سے کہا۔ ”بیٹے آؤ کچھ کام کریں ورنہ بھوکے مر جائیں گے اور اب واپس جانے کا بھی تو چارہ نہیں۔ تو نے غلطی کی کہ بزرگوں کا کہا نہ مانا اور چوتھے گھونٹ اُتر آیا میں نے غلطی کی کہ دودھ کے کٹورے کو لات مار کر ادھر چلا آیا۔ وہاں بھینس دودھ نہیں دیتی تھی تو ہم اس کی گھاس روک لیتے تھے۔ یہاں تو کوئی شنوائی ہی نہیں۔ آؤ اب اپنی کرنی بل کر بھگتیں۔“

چنانچہ اس نے خود کئی قلا بازیاں لگانی سیکھیں۔ بنسری اور ڈگڈگی خرید لی۔ بجو کو تماشے کرنے سکھائے۔ اس طرح دونوں کے پیٹ کا دھندا چل نکلا۔ بجو کبھی کبھی ترنگ میں نہ ہوتا تو کرتب تماشے دکھانے سے انکار کر دیتا۔ مجبوراً لڑکے کو اُسے ڈنڈا دکھانا پڑتا۔ اور ڈنڈا تو اچھے اچھوں کو سیدھا کر دیتا ہے۔ نئی جگہ آ کر یہ بات بجو بھی سمجھ گیا تھا اور خود اس کا مالک بھی۔ جسے وقت نے ایک دم لڑکے سے بوڑھے میں تبدیل کر دیا تھا۔ بیچ میں جوانی تو کہیں ایسے اڑنچھو ہو گئی تھی جیسے اس راہ پر آئی ہی نہ ہو۔

”دے سخی داتا۔ تیرا بھلا ہو گا۔“ تماشہ دکھا کر اس نے خنگر ایچ میدان دھرا ہی تھا کہ اس میں پہلا سکہ جو پڑا وہ دس کا نوٹ تھا۔ اس نے نوٹ ڈالنے والے کی طرف دیکھا اور اس کے منہ سے دعاؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اتنی بڑی رقم اور یک مشت دو سال تک اُلٹی سیدھی پھنکیاں کھانے اور بجو کو نچانے اور تماشے دکھانے کے بعد اس نے ابھی تک نہیں دیکھی تھی۔

"مداری۔ یہ بندر ہمیں دوگے؟" اجنبی نے سوال کیا۔

"صاحب یہ تو میری روٹی روزی کا وسیلہ ہے۔" وہ بولا۔

"مہینے میں کتنا بنا لیتے ہو؟"

"یہی سو سوا سو سرکار۔ بس حضور روٹی روزی کا دھندا ہو جاتا ہے۔"

"میں تمہیں سال بھر کا خرچہ دے دوں تو بندر سے جُدا ہونا برداشت کر لوگے؟"

وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ بندر اس کی روزی روٹی کے وسیلے کے ساتھ ساتھ دوست بھی تو تھا۔ وہ اپنے سارے دُکھ درد اسے ہی سُنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا کرتا تھا۔ وہ بولا، "صاحب، بجو میرا ساتھی ہی نہیں، بھائی بھی ہے اور وطن کی نشانی بھی۔"

"دیکھو۔ بھائی بھائی سے جُدا ہوتا آیا ہے۔ کون زندگی بھر ایک ساتھ رہ پایا ہے۔ یہی دُنیا کا دستور ہے۔" اجنبی بولا۔ "لو یہ ڈبل رقم ہے اب انکار نہ کرنا۔ ہمیں تمہارا بجو پسند آگیا ہے مگر فکر مت کرنا میں اُسے بہت آرام سے رکھوں گا۔"

اور اس نے نوٹوں کی گڈی زبردستی نہ کرتے مداری کے ہاتھوں میں گھُسیڑ دی۔ مداری نے بجو کو اجنبی کے کندھے پر بٹھا کر رسّی اس کے ہاتھوں میں پکڑا دی۔ وہ پہلے بھی تماشہ دکھانے کو بجو کو کسی کے کندھے پر بٹھا دیتا تھا اور بجو کچھ دیر وہاں بیٹھ کر اور اس آدمی کے ہاتھ سے کوئی کھانے کی چیز پا کر مُنہ میں بھر لیتا تھا یا کوئی اگر اسے نوٹ یا سِکّہ پکڑاتا تو وہ اسے لا کر مداری کو دے دیتا تھا یا اس کے منگرے میں ڈال دیتا تھا۔

بجو بہت دیر اجنبی کے کندھے پر بیٹھا رہا اور اجنبی لمحہ بہ لمحہ، قدم بہ قدم مداری سے دُور ہوتا گیا۔ بجو سمجھا شاید اجنبی اسے کھانے کی کوئی چیز دلوانے کے لئے کسی دکان کی طرف لیے جا رہا ہے مگر جب اجنبی گھنٹہ بھر چلنے کے بعد بھی کہیں نہیں رکا تو بجو پہلے تو اس کے کندھے پر مچلا اور پھر چھلانگ لگا کر نیچے اُتر آیا۔ اُس نے مڑ مڑ پیچھے دیکھا مگر ہزاروں چہروں میں اس کا شناسا چہرہ کہیں غائب ہو چکا تھا۔ اس نے واپس بھاگ جانا چاہا مگر گلے میں پڑی رسّی کے جھٹکے نے اس کے قدم روک لیے۔ اجنبی نے پہلے تو اُسے ہلکے سے کھینچا مگر بجو جب کھُما ہوا وہیں رکا رہا اور دانت بھی دکھانے لگا تو اجنبی نے اُسے چھڑی دکھائی جو مداری کی ساتھ اُٹھا لایا تھا۔ مجبوراً بجو رسّی کی دُوری تک اس کے پیچھے پیچھے گھسٹتا ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اجنبی نے ایک دکان سے اس کے لیے مٹھائی اور چنے خریدے۔ بجو کو دکھانے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ روٹھا سا اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اجنبی ہر دس پندرہ منٹ بعد چنے اس کی طرف بڑھاتا۔ آخر بھوک کے پیٹ نے چند چنے اس کی ہتھیلی سے اُٹھا کر مُنہ میں ڈال لیے۔ پیار پیار سے اجنبی نے باقی چنے اور مٹھائی بھی آہستہ آہستہ اسے کھلا دی اور پھر اپنے کندھے پر سوار کر لیا۔

بجو تین چار دن تو بہت اُداس رہا۔ اجنبی کے گھر اس کی چارپائی سے بندھا ہر وقت دروازے کی طرف دیکھتا رہتا۔ مگر آہستہ آہستہ وہ اجنبی کے جھوٹے سچے پیار اور کبھی ڈنڈے کی مار کا عادی ہوتا گیا۔ اس کے بعد اس کی زندگی میں نئے نئے واقعات آنے لگے۔ مداری کے ساتھ وہ زندگی بھر پیدل چلتا رہا تھا۔ اس نے پہلی بار عجیب وغریب گاڑیاں دیکھیں۔ اُڑنے والی جادوئی دری دیکھی۔ وہ ایک بالکل نئے ملک آگیا تھا۔

نیا ملک نئے لوگ نیا مالک اور نئے نئے تماشے۔ ہاں اُسے یہاں بھی تماشے دِکھانے پڑتے۔ مالک کے ڈنڈا دکھاتے ہی اس کے ہاتھ گٹھری اُٹھا کر بغل میں دبا لیتے اور وہ ایک طرف کو چل پڑتا جیسے سسرال جا رہا ہو بیوی کو لانے۔ ڈنڈا ہاتھ میں لے کر کمر جھکا کر یوں چلتا جیسے بوڑھا ہو گیا ہو۔ ڈنڈے کی بندوق بنا کر ملٹری کا جرنل بن جاتا پچھلے ملک میں اس کی یہ ادا بہت پسند کی جاتی تھی۔ جب وہ تماش بینوں کو آنکھیں اور دانت دکھاتا، اُن پر بندوق تان لیتا تھا۔ اس کی یہ ادا اچھے اچھے کی جیبوں سے اچھی بھلی رقمیں نکلوا لیتی تھی۔ وہاں رُعب کی اداکاری سے لوگ پیسہ پھینکتے تھے شاید جس میں چھپا ان کے دِل کا دُکھ کا اظہار بھی ہوتا تھا یہاں لوگوں کو پیسہ پھینکنے کی عادت تھی۔ بھاری جیبیں یہی کیا کرتی ہیں کوئی نئی بات نہیں۔

نئے مُلک میں وہ نئی نئی جگہ تماشے دِکھاتا پھرا مگر نئے ملک کے نئے تقاضے تھے جن کا نہ مداری کو علم تھا اور نہ بجو کو۔ اگر مداری کو علم تھا بھی تو وہ جان بوجھ کر لاعلم بنا ہوا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ نئے ملک میں اُس نے پندرہ بیس تماشے بھی دکھا لیئے تو پچاس بجوؤں کی قیمت وصول ہو جائے گی۔ ملک چھوڑنا پڑا تو وہ بجو کو کسی درخت پر بٹھا کر اپنی راہ لے گا۔ یا داؤ لگا تو ایسے ہی کسی دوسرے پڑوسی امیر ملک میں داخل ہو جائے گا۔

بجو دیکھتا، نیا ملک نئے لوگ، نئی آزادیاں اور کھانے پینے کی افراط مگر پھر بھی فکر اور کرب کی آڑی ترچھی لکیریں دل کی تمام دُنیا کو کاٹتی اندر ہی اندر چلتی سی محسوس ہوتی رہتیں۔

وہ جگہ بہت بڑی تھی کھلی سڑک دُور جس کے ایک طرف ایک محل سی بہت بڑی بلڈنگ۔ دوسری جانب بہت بڑا ابھرا بھرا بازار پیچھے ایک بہت بڑا ہوٹل، سینما اور قسم قسم کی دکانوں کی قطار جہاں وہ کئی دنوں سے شو دے رہا تھا۔ ہاں نیا مالک اب بجو کے کھیل کو تماشہ نہیں، شو ہی کہتا تھا۔ وہاں بہت بھیڑ اکٹھی ہو جاتی تھی اور مالک کی ولایتی ٹوپی میں سِکے بارش کی طرح برستے تھے۔ ایسے ہی کسی شو میں کسی گوری چمڑی والے تماش بین نے اعتراض کیا تھا کہ اسے بجو کو ڈنڈا مارنا تو ایک طرف دکھانے تک کا بھی حق نہیں۔ اعتراض کرنے والے نے اُسے اخبار کی دوسری سُرخی بھی دکھائی تھی جس میں خود ساختہ بڑے بھائی قسم کے مُلک کے صدر کے ایک کُتے کے کان کھینچنے پر کچھ لوگوں نے پُرزور اعتراضات کیے تھے۔ یہاں انسانوں پر تو کیا جانوروں پر بھی ظلم برداشت نہیں کیا جاتا حتیٰ کہ انہیں ذبح کرتے وقت بھی ذرا سی بھی تکلیف کا احساس نہیں ہونے دیا جاتا۔ اعتراض کنندہ نے اُسے بتایا تھا۔ مجبوراً اُسے ڈنڈا ایک طرف دھر دینا پڑا مگر اس کے پاس بجو کو نچانے کا دوسرا طریقہ بھی تھا جو ڈنڈا دیکھے بغیر بھی اُسے ناچنے اور تماشے دکھانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ وہ پُرانے مالک کی ٹیپ پر ریکارڈ شدہ آواز تھی جسے نیا مالک بجا کر، بجو سے من چاہے کھیل کروا لیتا تھا۔ بجو اب بنا ڈنڈا کے بھی ناچ لیتا تھا بلکہ پہلے سے اچھا ہی ناچتا تھا۔ اب اس کے دل میں ڈنڈے کے لئے نفرت آ گئی تھی اور خوف نکل گیا تھا۔ یہاں کا ماحول ہی کچھ اسی طرح کا تھا۔

اس دن مالک نے اپنی ڈگڈگی بجائی ہی تھی اور لوگ جمع ہونے شروع ہوئے ہی تھے کہ دو باوردی سپاہی بھی مجمع میں آ کھڑے ہوئے وہ دراصل اُسے وہاں سے ہٹانے آئے تھے مگر بجو کے کھیل میں ایسے محو ہوئے کہ اپنی ڈیوٹی تک

بھول گئے۔ بعد میں جب انھیں ہوش آیا تو ان کی حاکمانہ رگ پھڑکی۔ فرمایا۔ بھاگ یہاں سے۔ یہاں یہ سب منع ہے"۔ مجبوراً اُسے شو بند کرنا پڑا۔ دوسرے دن پھر اُس نے مجمع لگایا تو اسے دھر لیا گیا اور تھانے لے جا کر اس شرط پر چھوڑا گیا کہ وہ ہفتے کے اندر اندر بجو کو اپنے وطن واپس بھیج دے گا۔ وہ رویا پیٹا تو بہت' اپنی غریبی روزگار اور مجبوریوں کا واسطہ دیا۔ کہا کہ حضور یہی تماشے دیکھنے ہزاروں کی رقمیں خرچ کر کے آپ کے شہری ہمارے ملکوں کو جاتے ہیں۔ میں تو خدمتِ خلق کے جذبے سے آپ کے من بھاتے تماشے کو آپ کے دروازے پر لے آیا ہوں۔ مجھے تو حضور سرکار دربار سے انعامات سے نوازا جانا چاہیئے اور آپ ہم الٹا۔ کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا مگر ادھر سے ایک ہی رٹ لگی رہی کہ یہاں دوسرے ملک کے جانور رکھنے کی اجازت نہیں۔ آخری کوشش کے طور پر وہ بولا۔

"جانور؟ بجو جانور نہیں۔ یہ تو میرا بھائی ہے۔ میری روٹی روزی کا وسیلہ ہے"

"تو کام کرو۔ خود کام کیوں نہیں کرتے" داروغہ نے سوال کیا۔

"کام کہاں ملتا ہے صاحب" اس نے فریاد کی۔

"یہاں کام کی کمی نہیں۔ ہمیں تو مزدوروں کی اشد ضرورت ہے۔ بولو کام کرو گے؟"

اندھا کیا چاہے' دو آنکھیں ـــ وہ اسی چکر میں تو یہاں آیا تھا۔ سر ہلاتے ہی اُسے کام کرنے کا اجازت نامہ مل گیا۔ اب اُسے بندر کی کیا ضرورت تھی۔ مرے چاہے جیئے۔ کام نہ لگنے تک اُسے بے کاری بھتہ ملنے لگا جس کی پہلی قسط ہی اس قدر تھی کہ بجو کو آرام سے واپس بھجوایا جا سکتا تھا۔ اس نے بجو کو پرانے مالک کے ہاں واپس بھیج دیا۔ ساتھ میں پہلے سے تین گنا زیادہ رقم بھی۔

پرانے مالک نے کچھ دن اُسے آرام سے رکھا مگر پیسہ ختم ہوتے ہی پھر بدستور پرانی ڈگر پر اُسے بازار لے آیا۔ نچانے کے لئے ڈنڈا اُٹھایا کہ اسے اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ آتا ہی نہیں تھا مگر بجو ٹس سے مس نہ ہوا اور نہ ہی اس بیچ مالک کی پیسے کی زور پر بڑھ گئی بڑی بڑی مونچھوں سے خوف زدہ ہوا۔ وہ بدل چکا تھا۔ اُسے دوسری قسم کی ہوا لگ گئی تھی۔

دُوسری رات اس نے گلے سے رسّی نکالی اور بھاگم بھاگ واپس اپنے درختوں کے ذخیرے میں پہنچ گیا۔ جہاں اس کے پرانے بندر بھائی قیام کرتے تھے۔ اس نے اب نہ صرف خود چڑیئے گھونٹے جانے سے توبہ کر لی تھی بلکہ ایک تجربہ کار بزرگ کی طرح نئے اُٹھتے بالے نوجوان بندروں کو اُدھر جانے سے منع بھی کرنے لگا تھا۔

سانپوں کا جوڑا

Rekhta

اِنسان کا اِنسان کو دبا کر رکھنا، اِنسانی جبلت میں شامل ہے۔ ایک اِنسان اپنے سامنے جب ہزاروں جُھکے ہوئے سر دیکھتا ہے تو ایک ایسی خوشی سے سرشار ہو جاتا ہے جو اُس کی رگ رگ میں مسرت کی لہر سی دوڑا دیتی ہے۔ یہ خوشی بڑی طاقتیں چھوٹی طاقتوں کو انگوٹھے تلے رکھ کر، کوئی ڈکٹیٹر اپنی رعیت پر ظلم و ستم کرکے یا آس پاس کی چھوٹی اور کمزور ریاستوں پر حملہ کرکے اور لاکھوں لوگوں کے سروں کو جُھکا کر حاصل کرتا ہے۔ کوئی زمیندار اپنے مزارعوں پر ہنٹر برسا کر، کوئی گورا یورپین، حبشیوں کے گلوں میں آہنی زنجیروں کے طوق ڈال کر، اُستاد اپنے شاگردوں پر اُستادی جتا کر، ماں باپ اپنے بچوں پر حقوق کا اِستعمال کرکے، مرد بیویوں پر مذہب اور دھرم کی آڑ میں مجازی خُدا یا پتی پرمیشور بن کر، لیڈر قوم کے سامنے جھوٹے وعدے اور نئے نئے پروگرام رکھ کر، آجکل کی پڑھی لکھی آزاد خیال بیویاں حقوقِ نسواں کا سہارا لیکر اور نوجوان اینگری ینگ مین کا ڈھونگ رچا کر، اور نئے نئے نعرے ایجاد کرکے بڑے بڑوں کو اپنے سامنے جائز و ناجائز طریقوں سے جُھکانے میں مسرت حاصل کرتے ہیں۔ فی زمانہ کوئی یہ نہیں چاہتا کہ دُنیا کے مسائل حل ہو جائیں کیونکہ اِس طرح خود اُن کی اپنی دُکانیں بند ہو جائیں گی۔ آپ شاید میرے خیالات سے متفق نہ ہوں اور ہو سکتا ہے میری بات سَو فی صدی ٹھیک بھی نہ ہو مگر ایسا بھی نہیں کہ میری بات میں کچھ بھی سچائی نہ ہو۔ خیر چھوڑیئے اِس قصّے کو آپ کہانی سُنیئے۔

فرینکفرٹ (جرمنی) میں سائل کے پاس مسٹر ہاشم کا ایک بہت بڑی تیرہ منزلہ بلڈنگ کے چوتھے فلور پر ہندُستانی کپڑوں، نقلی زیوروں، اگربتیوں اور دوسری عجیب و غریب ہندوستانی اشیا کا سٹور ہے۔ آجکل معمولی ہٹی والا بھی اپنے آپکو بزنس مین یا امپورٹر کہتے اور اپنی دُکان کے ساتھ ایک آدھ کمرے کا دفتر سجا کر رکھتے ہیں تاکہ اپنے بچّوں سے کہہ سکیں کہ آفس جا رہا ہوں۔

میں فرینکفرٹ کے سب سے بڑے روزانہ جرمن اخبار "فرینکفرٹر رُونڈشا" میں کام کرتا ہوں۔ جب کبھی اوور ٹائم لگنے سے ڈبل آمدن ہو جاتی ہے تو میں اسٹاف کینٹن میں بیٹھنے کی بجائے سیکشن ہاؤس کے شاندار ریسٹورنٹ "پیراڈائز باف" میں جا بیٹھتا ہوں۔ وہیں ایک شام ایک ٹیبل پر اچانک میری ملاقات مسٹر ہاشم سے ہوئی تھی۔ وہ جرمن،

انگریزی، ہندی یا اُردو، جو بھی زبان بولیں اُس میں سے اُن کی پنجابی نہ صرف رِستی بلکہ ٹپ ٹپ گرتی نظر آتی ہے۔ بس اِسی ٹپ ٹپ نے ہمیں چند گھنٹوں کی دوستی عطا کر دی ہے۔ ورنہ میں قلم کا مزدور اور وہ پیسے کا پُتر بنیا۔ کہاں کی دوستی، کیسی قربت؟

میں نے ہاشم صاحب کو پیسے کا پُتر کہا ہے تو مجھے اِس بات کا ثبوت بھی دینا چاہیئے۔ فرینکفرٹ میں مائن ندی کنارے شہر سے سیکسن ہاؤس کی طرف پُل کراس کرتے ہی دائیں طرف ہر سنیچروار کو ایک کباڑی بازار لگتا ہے۔ جسے جرمن زبان میں فلوح مارکیٹ کہتے ہیں۔ وہاں بکنے والا پچانوے فیصدی سامان گُوڑا کباڑ ہی ہوتا ہے مگر اُن میں کبھی کبھی پُرانی اینٹیک قسم کی چیزیں بھی بکنے آجاتی ہیں جو قدر دانوں کو کشاں کشاں وہاں کھینچ لاتی ہیں اور وہاں ایک بہت بڑے میلے کا سماں بن جاتا ہے۔ وہاں ہاشم جیسے پیسے کے دیوانے باقی پانچ فی صد سیٹھ لوگ بھی اپنا نیا مگر بازار میں نہ بِک سکنے والا اور تھوڑے سے نظر نہ آنے والے نقص کا مال، قیمت میں تھوڑی سی کمی کر کے ہزاروں مارک میں بیچ لیتے ہیں کیونکہ ایسی ٹیڑھی میڑھی چیزوں کے عاشق ایسے ہی بازاروں میں زیادہ نظر آتے ہیں۔

ایک دِن ایک ہندوستانی کپڑوں کے سٹال پر جب میں رُکا تو دیکھا مسٹر ہاشم خود وہاں کھڑے کپڑے بیچ رہے تھے۔ مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر اُن کے اندر کا ہندوستانی سیٹھ پن جاگ اُٹھا۔ اور وہ مجھ سے نظریں چُرانے لگے۔ مگر مجھے اپنی جرمن گرل فرینڈ کے لئے ایک کڑھا ہوا بلاؤز اِس قدر پسند آیا کہ میرے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔ آخر آنکھیں چار ہوئیں تو وہ بولے۔ "سنتوش صاحب۔ نوکر کھانا کھانے گیا ہے۔ بجانے ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا۔ پلیز ہیلپ می۔"

گاہکوں کی بھیڑ زیادہ تھی اور اُن سے سنبھل نہیں پا رہی تھی۔ دس پندرہ قسم کی چیزیں تھیں جن پر ریٹ درج تھے۔ میں اُن کا ہاتھ بٹانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پانی پینے کے بہانے غائب ہوئے تو پُورے چار گھنٹوں بعد مارکیٹ ختم ہونے پر ہی واپس آئے۔ سامان اور رقم چیک کی۔ نوٹوں کی ڈھیری معمول سے چار گنا زیادہ بڑی تھی اور تقریباً تمام ایسا ویسا سامان بِک چکا تھا۔ میں دوستی دوستی میں اُن سے ایک بھی پیسہ لینے پر جب تیار نہ ہوا تو وہ نہال ہو گئے۔

شاید اُنہیں میری ایمانداری اور محنت پسند آگئی تھی۔ اب وہ مجھے جہاں بھی مِلتے۔ اپنے ہاں نوکری کر لینے کی پیشکش ضرور کرتے۔ "سنتوش صاحب۔ کیا رکھا ہے اخبار کی نوکری میں۔" وہ کہتے۔ "میرے ہاں آجاؤ۔ پانچ نوکر ہیں مگر سب بے ایمان۔ آپ کی ڈیوٹی اُن پر صرف سُپرویژن کی ہوگی۔"

مگر مجھے اپنی اخبار کی نوکری زیادہ پسند تھی اسلئے میں اُن کے ہاں کُل وقتی جاب تو نہ لے سکا۔ ہاں کبھی کبھی اُنکی مدد کرنے جانے لگا۔ وہیں میری ملاقات ایک نوجوان چھوکرے ہرنیش آنند سے ہوئی۔ ہرنیش صبح دس بجے سے چار بجے تک ہاشم صاحب کے سٹور (HASHAM G M B H) پر کام کرتا تھا۔ ایک دِن کام کرتے ہوئے بھی جب میں نے اُسے ہاشم صاحب کے آگے کام کے لئے گڑگڑاتے دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ تبھی مجھ پر یہ راز کُھلا کہ وہ وہاں زور زبردستی سے ہر روز مُفت کام کرتا اور کام مانگتا ہے جسے ہاشم صاحب بڑی سختی سے جھڑک کر آئندہ اپنے سٹور پر آنے سے منع کر دیتے ہیں مگر وہ پھر بھی آتا ہے اور بِنا تنخواہ کام کرتا رہتا ہے۔ ویسے وہ صبح سویرے چار سے دس بجے تک

فرینکفرٹ کی قریبی بڑی سبزی منڈی میں سبزیوں سے بھرے ٹرک خالی کروانے میں مدد کرکے اپنی اچھی بھلی روٹی روزی کھری کر لیتا ہے۔ وہ کئی مہینوں سے ہاشم صاحب کے ہاں کام کی تلاش میں اُنکے سٹور میں صفائی ٹھیک کر دینے کا کام مُفت کرتا ہے اور اُن سے گالیاں کھا رہا ہے۔ ایک طرف تو ہاشم صاحب اُسے روز دُھتکارتے ہیں اور دوسری طرف مجھے بڑی حلیمی سے تقریباً روز ہی اپنے ہاں کام کرنے کی پیشکش کرتے ہیں۔ ہے نا ایک معمہ؟

میں تین ماہ کے لئے وطن چلا گیا تھا۔ کچی نوکری تھی۔ واپس آیا تو مختار نے جواب دے دیا۔ اُدھر جب ہاشم صاحب کی آفر ملی تو میں نے فوراً اُسے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ دیکھا تو آنند بھی وہیں کام کر رہا تھا۔ اس کے کام کرنے کے انداز سے ہی مجھے پتہ چل گیا کہ اب اُسے ہاشم صاحب کے ہاں پکا کام مِل گیا ہے۔ ایک دِن میں نے اِس سلسلے میں ہاشم صاحب سے استفسار کیا تو وہ بولے "وہ بھی بنیا، میں بھی بنیا۔ ایک ہی ہانڈی میں دو سانپ تو نہیں رہ سکتے مگر مجبوری ہے۔ سالے کو گالیاں دیتا ہوں۔ دِل چاہتا ہے تو دو تھپڑ بھی جڑ دیتا ہوں۔ اِس سے مجھے جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ اُس کے پورے کام کے عوض، آدھی تنخواہ میں مہنگی تو نہیں نا۔"

جرمنی میں میرے پاس پکا ورکنگ ویزا نہیں تھا۔ چنانچہ باہر کا ویزا حاصل ہوتے ہی میں ناروے منتقل ہو گیا اور خود کو سیٹل کرنے کے چکر میں دس سال تک فرینکفرٹ کی طرف مُڑ کر دیکھ تک نہ سکا۔ پچھلے دِنوں ایئر انڈیا سے دہلی جاتے ہوئے راستے میں کچھ گھنٹوں کے لئے فرینکفرٹ رُکنا پڑا تو دل چاہا دو پل ہاشم صاحب سے بھی دُعا سلام ہو جائے۔ چوتھی منزل پر اُن کے سٹور پہنچا تو ہاشم جی ایم بی ایچ کی جگہ (ANAND G M B H) کا بورڈ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اندر پہنچا تو آفس کی اُسی کُرسی پر برنش آنند براجمان تھا اور اپنے اسٹاف کے کچھ نئے چھوکروں کو کسی بات پر جھڑک رہا تھا۔

کچھ دیر بعد میرے ہاشم صاحب کے بارے میں پوچھنے پر وہ بولا۔ "سنتوش صاحب۔ اُن کی پتنگ کٹ گئی۔ آج کل اپنی پتنگ بلندیوں پر اُڑ رہی ہے۔"

مسزِ وِج

عجیب بات تھی کہ مسزِ وِج کو عجیب عجیب تکالیف شروع ہو گئی تھیں۔ وہ پہلے تو انہیں اندر اندر دباتی رہی پھر آہستہ آہستہ خود ہی اُن کا علاج اور ردّ و ادل کرنے لگی۔ میاں بیوی نے نزدیکی ہسپتال کا ڈاکٹر اپنا اچھا دوست بنا لیا تھا۔ اُسے گھر کی محفلوں میں بھی بُلایا جاتا تھا۔ وہ اپنے پورے خلوص کے باوجود مسزِ وِج کی بیماری کی تشخیص نہ کر سکا۔ کبھی جسم پر کسی بھی جگہ ہلکی سی سُوجن آ جاتی، سوزش کبھی خارش تنگ کرتی۔ کبھی سانس پھُولنے لگتا۔ کبھی چھاتی میں ہلکا ہلکا درد اٹھتا اور کچھ نہیں تو گلا ہی جلتا رہتا۔ ڈاکٹر نے مسزِ وِج کے ہر قسم کے ٹیسٹ کروا لیے تھے۔ سب کچھ نارمل تھا۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ وہ صرف پچاس کو کراس کر رہی تھیں۔ یہاں ناروے میں ایسے مریضوں کو کوئی دوا نہیں دیتے۔ چند دن آرام کروا لیتے ہیں، جس سے مریض اپنے آپ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر انہیں آرام کرنے کا کئی دن کا سرٹیفکیٹ دیتا مگر وہ آرام نہ کریں، کام پر چلی جائیں، جیسے انہیں کام سے عشق کی حدوں تک پیار تھا۔ ان کی ڈیوٹی ریلوے سٹیشن پر کبھی انکوائری اور کبھی بکنگ پر لگتی تھی۔ جاب پسند ہونے کے باوجود انہیں کبھی کبھی بہت ہی بور رنگ لگتی مگر گھر کے اکیلے پن سے باہر کا ماحول پھر بھی قدرے بہتر تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ انہیں کوئی اور نوکری پسند بھی نہیں تھی۔

ڈاکٹر پیر ہانسن پریشان تھا کہ اُس کی مریضہ آرام بھی نہیں کرنا چاہتی اور کام کے اُنس میں بیماری برداشت کرتی رہتی ہے۔ دس دن تک اُس کا علاج کرتے کرتے اب وہ خود بھی چاہنے لگا تھا کہ مریضہ کو آدھی پنشن پر گھر بٹھا دے تاکہ وہ گھر کے ہلکے پھلکے کام سے دل بہلا سکے۔ اس کی تمام تشخیصات اس نتیجہ پر پہنچی تھیں کہ مریضہ کو آرام اور ذہنی سکون ہی ٹھیک رکھ سکتا ہے۔ ذہنی سکون؟ کس بات سے؟ کیا اُس کا شوہر پیار نہیں کرتا یا کسی دوسری عورت کے چکر میں پھنسا ہے۔ بچوں کی فکریں پریشان رکھتی ہیں۔ کوئی خواہشات دبی پڑی ہیں۔ اُس نے ایک ماہرِ نفسیات کی طرح بھی اور ایک پولیس آفیسر کی طرح بھی اُنکے گھر کے اندر باہر کی ہر طرح کُرید کُرید کر تفتیش کی۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ ہاں اُن کی کچھ خواہشات کا دبا پڑا ہونا ممکن ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر سوچتا۔ اس کے لئے اب اُنکے خاوند کو بھی اپنی تشخیص جمع تفتیش میں شامل کرنا ضروری ہوگا۔ پیر ہانسن میڈیکل ڈاکٹر تھا۔ اصولی طور پر یہ کیس کسی ماہرِ نفسیات کا ہی ہو سکتا تھا اور اُسے چُپ چاپ یہ معاملہ

rekhta

کسی سائیکی آٹرسٹ کے حوالے کر دینا چاہئیے تھا مگر جیسے اُستادوں کو اپنے خاص خاص شاگردوں سے لگاؤ ہو جاتا ہے اِسی طرح ڈاکٹروں کو بھی اپنے کچھ مریض پیارے لگنے لگتے ہیں۔ ایسی ہی اُلفت ڈاکٹر ہالسن کو اس جوڑے سے ہو گئی تھی۔ ویسے بھی یہ جوڑا فارنر یعنی ہندوستانی ہونے کی وجہ سے اُس کی خاص توجہ کا طالب تھا۔ اِس سے ڈاکٹر کو نئے مریض اور اُسکے مرض کے نئے نئے حالات کا علم ہوتا اور اُس کی طبی قابلیت میں اضافہ بھی ہوتا تھا۔ ڈاکٹر نے مسٹر وِج کے لئے ایک سوالنامہ تیار کیا۔

عُمر

عادات وخصائل

موجودہ کام، سابقہ کام

شادی کن حالات میں ہوئی؟ لَو میرج تھی یا ارینجڈ؟؟

اِنڈیا میں گھر اور آس پاس کا ماحول کیسا تھا۔

پڑوسی کیسے لوگ تھے

سابقہ زندگی کیسی گذری۔

کِن حالات میں اور کیوں اپنا ملک چھوڑا۔

اُس نے وقت مقرر کر کے ایک دِن مسٹر کمار وِج کو اپنے پاس بُلایا اور کہا۔ ”آپ کو پتہ ہے۔ آپ کی بیوی بیمار رہتی ہیں۔ میں نے اُن کا پورا پورا معائنہ کیا ہے۔ اُنکے اندر کوئی کمی نہیں۔ بالکل نارمل اور صحت مند جسم ہے پھر یہ چھوٹی چھوٹی بیماریاں اُنہیں کیوں تنگ کر رہی ہیں؟“

”آپ ڈاکٹر ہیں“ مسٹر وِج بولے جیسے کہنا چاہتے ہوں یہ تلاش کرنا آپکا کام ہے۔ ”میں خود اُن کے لئے پریشان ہوں۔“

”مسٹر وِج اس سلسلے میں مجھے آپ کے تعاون کی اشد ضرورت ہے“ ڈاکٹر نے کہا۔

”فرمایئے“ کچھ دیر رُک کر مسٹر وِج بولے۔ ”میں نے تو اُنہیں خوش رکھنے کو ہی ہجرت کی ہے اور اِتنی دُور یہاں آیا ہوں“

”تو کیا وہ وہاں خوش نہیں تھیں؟“

”نہیں کوئی ایسی بات تو نہیں تھی۔ میں ہی کچھ زیادہ اُمنگی شخص تھا۔ چاہتا تھا بیوی اور بچوں کو دُنیا کا ہر آرام مہیا کر سکوں“

”مگر آپ اپنی بیٹی کو تو یہاں آنے سے پہلے بہت اچھی جگہ شادی کر کے بسا چکے تھے۔ آپ کی بیوی نے بتایا ہے۔ ہندوستان میں لڑکی کی شادی اور اُس کا اچھی طرح بس جانا ہی ماں باپ کا سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے اور آپکا بیٹا بھی اپنے سکول میں بہت اچھے طالب علموں میں شمار ہوتا تھا“

”جی وہ تو ٹھیک ہے“ مسٹر وِج نے ڈاکٹر کی طرف اِس طرح دیکھا جیسے پوچھتا ہو یہ پولیس قسم کی تفتیش ڈاکٹری

کے پیشے سے کیسے متعلق ہو گئی۔ ڈاکٹر نے اُس کے خیالات کو پڑھ لیا۔ "مسز ورج ہمیں اس قسم کے مریض کے لئے ایسا سب کچھ جاننا ضروری ہے۔ میں شکر گذار ہوں مسز ورج کا، کہ وہ مجھے پورا تعاون دے رہی ہیں۔ ویسے وہ بالکل ٹھیک ہیں، میرا مطلب ہے، ہو سکتی ہیں اگر آپ بھی پورا پورا تعاون دے سکیں اور اپنی پچھلی گھریلو ہسٹری مجھ سے پوری طرح بیان کریں۔ میرے پاس آپکے لئے چند سوالات ہیں اگر اُن کا جواب مجھے مل جائے تو مسز ورج کے علاج میں مجھے بہت مدد ملے گی۔" اور اُس نے سوالنامہ مسٹر کمار کے آگے دھر دیا۔

"عمر تریسٹھ سال" مسٹر ورج پڑھنے اور ساتھ ساتھ جواب دینے لگے۔

"شانت طبیعت کا مالک ہوں۔ مطالعے کا شوق ہے۔ ہم میاں بیوی شروع سے ہی آپس میں پیار و محبت سے رہتے آئے ہیں۔"

"میں انڈیا میں ریلوے سٹیشن ماسٹر تھا۔ اب یہاں بنک میں ملازم ہوں۔"

"دہلی سرائے روہیلہ چھوٹی لائن کا ایک بڑا اسٹیشن ہے۔ وہیں پر رما سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ وہاں سے پانچویں سٹیشن گوڑگانوہ درون آچاریہ کالج میں پڑھنے جاتی تھیں تو اکثر میری ڈیوٹی میں اپنی گاڑیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میرے دفتر میں بھی آجاتی تھیں۔ وہیں سے ہم کچھ نزدیک آئے اور۔"

"تو۔"

"ہاں۔ ایک طرح سے لَو میرج ہی کہہ لیجئے۔ اِنکے والد دہلی کے بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ وہ اپنی بیٹی ایک ریلوے بابو کو نہیں دینا چاہتے تھے۔ مگر ہم نے زبردستی کر کے کورٹ میرج کر لی۔ اِنکے ڈیڈی نے ہمیں دو سال تک نزدیک نہیں پھٹکنے دیا۔ پہلی بچی ہوئی تو انہوں نے اُسے جا کر باپ کی گود میں ڈال دیا۔ پھر حالات آہستہ آہستہ نارمل ہوتے چلے گئے۔"

"میرے پاس ریلوے کوارٹر تھا۔ قریب ہی گاڑیاں آتی جاتی رہتی تھیں۔ یارڈ میں ہمہ وقت انجن چھک چھک کرتے شنٹنگ کرتے رہتے تھے۔ یہ بیٹھی کھڑکی سے اُن کی شنٹنگ انجوائے کیا کرتیں۔ کوئلے سے کالے کپڑوں اور کالے چہروں کے ڈرائیوروں اور فائرمینوں کو یہ بڑے انہماک سے دیکھتیں، کہتیں اُن کے چہروں پر محنت کا حسن ہے۔"

"اوہ — اب کچھ بات بن رہی ہے۔" ڈاکٹر اچانک بول اُٹھے۔

"آس پاس سب ریلوے کا ہی ماحول تھا اور ریلوے کے ہی لوگ تھے۔ بقول اِنکے "اُجلے دِلوں کے کالے لوگ"۔"

"عرض کر چکا ہوں کہ سابقہ زندگی بہت پُر سکون تھی۔ انہیں گاڑیوں کو آتے جاتے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اِن کی سیرگاہ ہی سٹیشن ہوا کرتی تھی۔ سٹیشن پر جب تک گاڑی کھڑی رہتی یہ انجن کو ہی تکے جاتیں۔"

"میرا تبادلہ ایک چھوٹے سے سٹیشن پالم پر ہو گیا۔ یہ سٹیشن دہلی سرائے روہیلہ کے مقابلے میں چھوٹا تھا مگر دہلی کا ہی سٹیشن ہونے کی وجہ سے تنخواہ اور گریڈ کے سلسلے میں سرائے روہیلہ سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ مجھے بہت آرام ہو گیا۔ بڑے سٹیشن کی ہر وقت کی بک بک جھک جھک سے جان چھوٹ گئی مگر انہیں پسند نہیں آیا، راس نہیں آیا

کہوں تو زیادہ مناسب ہوگا"

"کوئی خاص وجہ؟ ہو سکتا ہے انہیں بڑے شہر کی رونقوں میں رہنا پسند ہو۔"

"نہیں کوئی ایسی خاص بات میں نے محسوس نہیں کی کیونکہ یہاں پر ایک قسم کی میری اپنی حکومت تھی۔ وہاں میں اسسٹنٹ تھا جبکہ یہاں مکمل سٹیشن ماسٹر۔ بہرحال کسی بڑی ریاست کا وزیر ہونے سے کسی چھوٹی ریاست کا بادشاہ ہونا بہتر ہے۔"

"یہ آپ اپنی پسند کی بات کر رہے ہیں۔ انہیں یہ تبدیلی کیسی لگی؟"

"کچھ زیادہ پسند نہیں آئی۔ یہاں گاڑیاں کم تھیں اور ہر آنے والی ٹرین دو یا تین منٹ سے زیادہ نہیں رُکتی تھی شنٹنگ بھی کبھی کبھی ہوتی تھی۔ میں اب تبدیلی مانگتا تو دُور بیکانیر کے ریگستان کے کسی چھوٹے سے سٹیشن پر پھینک دیا جاتا۔ اِس لئے مناسب سمجھا کہ اگر دُور ہی جانا ہے تو کیوں نہ ایک پتھر سے دو شکار کر لوں اور میں اِدھر باہر نکل آیا۔"

"اب ایک آخری سوال پُوچھوں گا۔ جھوٹ مت بولیئے گا اور شرمائیے گا بھی نہیں، میں آپ کا ڈاکٹر ہوں۔ کیا آپ بطور میاں بیوی ایک دوسرے سے مطمئن ہیں۔

"جی بالکل۔ بہت اچھی طرح۔"

"اور بیڈ کمپنی؟"

"ہمارا سونے کا کمرہ ایک ہی تھا ایک ہی ہے اور بستر بھی مشترکہ۔"

"کیا آپ مجھے کسی دن اپنے گھر مدعو کر سکتے ہیں اور اِس بار میں آپکے صرف ڈرائنگ روم میں نہیں بیٹھوں گا بلکہ آپ کا سارا گھر دیکھنا چاہوں گا" ڈاکٹر نے مسٹر وِج کا ہاتھ دبا کر کہا۔ "یہ آپکی بیوی کے علاج کے لئے ضروری ہے مگر یہ سب باتیں انہیں مت بتائیے گا۔"

ڈنر کے بعد ڈاکٹر نے مسٹر وِج سے کہا۔ "آپ نوکری کے علاوہ کیا کرتے ہیں؟ میرا مطلب آپکی ہابی سے ہے۔"

"مجھے انڈین فلمیں دیکھنے اور مطالعے کا شوق ہے۔"

"اور مسز وِج آپ؟"

"پوسٹل ٹکٹ جمع کرتی ہوں۔"

"کچھ دِکھائیں گی؟"

اور ڈاکٹر نے نوٹ کیا کہ اُس کی ٹکٹوں میں زیادہ تعداد ریلوے سٹیم انجنوں کی تھی۔ جن میں پُرانے سے پُرانے انجنوں سے لیکر دُنیا کے سب سے بڑے انجن (THE BIG BOY) تک کی تصاویر بھی شامل تھیں۔ ایک کمرے میں ایک شیلف پر ایک پُوری کھلونا ٹرین رکھی تھی۔ پیچھے سٹیشن بلڈنگ تھی۔ ٹرین کے آگے وائی پی کلاس کا قوی ہیکل انجن لگا ہوا تھا۔ دیوار پر دو تصاویر بھی ریلوے انجنوں کی آویزاں تھیں۔

"سنا ہے مسٹر وِج۔ آپ دو سال بعد واپس جانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ وہاں کہاں بسنے کا ارادہ ہے؟"

مسٹر وِج سے پہلے ہی مسز وِج بول پڑیں۔ "یہ دہلی میں بسنا چاہتے ہیں جبکہ مجھے اب دہلی بالکل پسند نہیں۔"

"دہلی تو راجدھانی ہے اور بہت اچھا شہر ہے،" مسز ورج نے کہا۔

"خاک اچھا ہے۔ ہر وقت موٹروں کی پیں پیں، بھیڑ بھڑکا اور شور دم تک نہیں لینے دیتے۔"

"دیکھئے میڈم۔ ٹریفک کا بھیڑ بھڑکا آج کل ہر جگہ ہے۔ موٹروں کا نہیں تو ریلوں کا ہی۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"ریلوں کی بات اور ہے،" مسز ورج کا لہجہ ایسا تھا جیسے کوئی اپنے محبوب کی بات ڈوب کر کرتا ہے۔

ایک ہفتے بعد ڈاکٹر نے مسز ورج کو اپنے کلینک میں بلایا۔ "اب جبکہ پنشن لے کر آپ نے انڈیا میں بسنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو کوشش کیجئے گا۔ کہ آپ کا گھر کسی ایسے شہر یا قصبے میں ہو، جہاں پرانی وضع کے کالے ریلوے انجن چلتے ہوں اور آپ کا گھر سٹیشن کے اتنے قریب ہو کہ جہاں سے ایسے انجنوں کو آتا جاتا یا شنٹنگ کرتا دیکھا جا سکے۔ مسز ورج کو ایسے انجنوں سے ایک خاص لگاؤ ہے وہ اُسے مردانگی اور طاقت کی علامت سمجھتی ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں، کئی عورتیں اپنی یہ پیاس بڑے بڑے دریاؤں، ٹیلوں، سمندروں اور پہاڑوں سے پوری کرتی ہیں۔"

"انڈیا میں ہماری سردیوں کی ریلوے وردی ایک کالے گرم کپڑے سرج کی ہوتی ہے اور اُس پر سفید چمکدار دھات کے بٹن ایک خاص دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔ وہاں میں نے دیکھا تھا کہ وہ میری سردیوں کی کالی وردی کے بٹن اپنے ہاتھ سے بڑے پیار سے لگاتی تھیں اور میں محسوس کرتا تھا کہ سردیوں میں ان کے پیار کی شدت بھی معمول سے کچھ سوا ہو جاتی تھی۔ ایک بار اِن کی ڈائری میں میں نے یہ فقرہ بھی لکھا دیکھا تھا کہ گورا رنگ تو عورت کو سجتا ہے مرد تو شیام رنگ ہی اچھا لگتا ہے۔"

"مسٹر ورج۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ آپ انہیں کسی ایسے شہر میں رکھیں..... گھر کے ایک کمرے میں پورا ایک کھلونا قسم کا ریلوے نظام بھی لگوا لیجئے گا۔ ریلوے سٹیشن، واٹر ٹینک، سٹیشن بلڈنگ، کیبن، یارڈ، نیم بورڈ، سرنگیں وغیرہ، اُن پر ریلوے لائن فٹ کر لیجئے گا۔ پرانے قسم کے انجن اور گاڑیاں ملتی ہیں۔ بجلی سے چلتی ہیں۔ شہر میں پرنس سٹریٹ پر اُنکی دکان ہے۔ اِس طرح مسز ورج کی زندگی اپنی تمام نفسیاتی بیماریوں کو جھٹک کر اپنا ایک نیا اور تازہ سفر شروع کر سکے گی۔" ●●●

وہ کہاں ہے؟

آئیے اسے تلاش کریں۔ وہ ایک اور ہم انیک ہیں، پھر بھی اس نے ہم سب کا جینا حرام کر رکھا ہے۔ کیوں نہ پہلے میں آپ کو اس کے حلیئے سے آگاہ کر دوں۔ آپ اس کی تصویریں وانٹیڈ کے تحت جگہ جگہ دیکھ سکتے ہیں اور اس کے سر پر انعامات کے بارے میں بھی پڑھ سکتے ہیں، مگر اس کے تعارف کے بارے میں میری تمام کوششوں کے باوجود، مجھے شک ہے کہ آپ شاید ہی اس تک پہنچ سکیں۔ ویسے وہ ہمارے کندھے سے کندھا جوڑ کر ہمارے ساتھ چلتا ہے۔ ہمارے درمیان رہتا ہے۔ انسان کو خدا کا ہی رُوپ کہا گیا ہے، مگر وہ اس کا ایسا بگڑا ہوا روپ ہے کہ ہمارے اندر اور ہمارے قریب رہتے ہوئے بھی ہم سے جُدا رہتا ہے اور نظر نہیں آتا۔ اور اگر کبھی نظر آ بھی جاتا ہے تو ہماری آنکھوں میں دُھول جھونک کر ہمارے ہاتھوں سے صاف نکل جاتا ہے آپ کہیں گے، جب ایسی بات ہے تو پھر میں آپ کا خواہ مخواہ کیوں وقت برباد کر رہا ہوں۔ مگر بات یہ ہے۔ ہو سکتا ہے وہ مجھ جیسے لاکھوں سیدھے سادے آدمیوں کے ہاتھوں سے پھسل جاتا ہو، مگر کوئی نہ کوئی اس دنیا میں ایسا شخص ضرور ہو گا جو اسے کسی نہ کسی صورت پھانس لے گا۔ اور ہم سب کے دلدر دُور کر دے گا۔ بس میں اسی شخص کی تلاش میں یہ چند سطریں تحریر کر رہا ہوں۔

اتنا پڑھنے کے بعد آپ قدرتی طور پر میرے بارے میں بھی کچھ جاننے کے لئے بے قرار ہوں گے۔ اپنی تعریف کا پہلو نکلتا ہے، مگر قسم اُوپر والے کی، میں بہت ہی شریف انسان ہوں اور قطعی طور پر ویجیٹیرین۔ کبھی کسی مُرغے کی گردن کاٹنا تو ایک طرف کسی مَنڈے کو بھی ڈوبتے دیکھ لوں تو تنکے پر اُٹھا کر اُس کی جان بچا لیتا ہوں۔

آج تین دن سے میں اُسے بالکل اپنے آس پاس ہر جگہ کھڑا دیکھ رہا ہوں اور کئی آنکھوں میں اس کا دُھندلا دُھندلا عکس بھی دیکھا ہے، مگر مجال ہے کہ وہ میری گرفت میں آ جائے۔ ہوا یہ کہ مجھے عراقی ایر ویز سے براستہ بغداد واپس ناروے جانا تھا۔ حالانکہ میری سیٹ بک ہو کر او کے ہو چکی تھی، مگر اصولی طور پر ۷۲ گھنٹے یعنی تین دن پہلے مجھے ایر ویز کے دفتر کو بتانا تھا کہ میں واقعی سفر کر رہا ہوں۔ اس اطلاع کو ری کنفرمیشن کہتے ہیں۔ یہ شاید اس لئے ہے کہ آپ اچانک کسی وجہ سے اپنا سفر ملتوی کر بیٹھیں تو کمپنی کو ایک سیٹ کا نقصان نہ ہو۔ چنانچہ میں جب عراقی ایر ویز کے دفتر پہنچا

اور اپنی سیٹ کنفرمیشن کی اطلاع دینا چاہی تو کاؤنٹر کلرک نے کہا۔ "رانا صاحب، آپ کی سیٹ تو کینسل ہو چکی ہے۔"

میں نے حیران اور پریشان ہو کر پوچھا "کیوں؟"

جواب ملا کہ بغداد میں دیا ہوا میرا ایڈریس مکمل نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "ایڈریس تو مکمل ہے اور اسی ایڈریس پر ویزا حاصل کر کے آتے ہوئے میں وہاں پانچ دن قیام کر کے آیا ہوں۔ پھر اب تو میں ٹرانزٹ پسنجر کے طور پر صرف بغداد سے گزر رہا ہوں۔ ملک میں داخل نہیں ہو رہا ہوں۔ اس لئے اب آپ کو بغداد میں میرے ایڈریس کی کیا ضرورت ہے۔؟"

بڑی لے دے اور پاسپورٹ کی جانچ پڑتال کے بعد کلرک صاحب اس سوال پر اَڑ گئے کہ آپ ناروے کیوں جا رہے ہیں۔ میں نے بتایا کہ میں وہاں پچھلے پندرہ سال سے بیوی بچوں کے ساتھ مقیم ہوں اور پاسپورٹ کا وہ صفحہ نکال کر دکھایا جس میں اوسلو پولیس کی جانب سے مجھے تا زندگی ناروے رہنے اور کام کرنے کا اجازت نامہ ملا ہوا تھا۔

مگر وہ شہ بہان نارویجین زبان سے نابلد تھے۔ عقل کے پیچھے لاٹھی لئے ہوئے بولے "میں یہ زبان نہیں جانتا۔"

"میں نے عرض کیا، نارویجین ایمبیسی سے فون پر چار سطریں ہی تو ہیں، ترجمہ کروا لو یا پھر میرا اعتبار کر سکو تو میں ہی ترجمہ کئے دیتا ہوں۔"

انہیں دوسرا طریقہ آسان محسوس ہوا فرمایا "پڑھیئے"

میں نے اجازت نامے کا ترجمہ کر کے سُنا دیا۔

بولے "ٹھیک ہے ٹیلیکس کئے دیتا ہوں، کل تک جواب آ جائے گا۔"

دوسرے دن فون کیا تو جواب آ چکا تھا۔ بولے "آپ کی سیٹ کنفرم ہو چکی ہے۔"

ایئرپورٹ پر پھر پاسپورٹ کی جانچ پڑتال شروع ہو گئی۔ وہاں بھی کلرک صاحب عقل سے پیدل بولے "آپ نے کنفرمیشن نہیں کروائی اور پاسپورٹ نہیں دکھایا؟"

میں نے عرض کیا۔ "دکھایا ہے اور بڑی اچھی طرح دکھایا ہے۔"

وہ قریب ہی کھڑے ایک صاحب کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ "وہاں یہ صاحب ڈیوٹی پر تھے انہوں نے آپ کا پاسپورٹ دیکھا تھا؟"

بہتر تو یہ تھا کہ یہ سوال ان ہی صاحب سے کیا جاتا، مگر مجھ سے پوچھا گیا تھا، اس لئے مجھے ہی جواب دینا پڑا۔ "مجھے چہرے یاد نہیں رہتے، مگر جو صاحب بھی وہاں کاؤنٹر پر براجمان تھے، انہوں نے اچھی طرح دیکھا تھا۔"

"نہیں صاحب۔ ایسے نہیں چلے گا۔ میں آپ کو کیسے جانے دوں؟"

"میرے پاس وہاں کا ویزا ہے۔ کنفرمڈ ٹکٹ ہے۔ جیب میں کوئی ہتھیار نہیں۔ پچھلا سارا ریکارڈ صاف ہے۔ بتایئے میں اور کیا کروں؟"

میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا اور میں چونک اُٹھا۔ ان میں مجھے دھندلا سا اپنا عکس نظر آیا۔ ارے یہ تو ہو بہو بے ایمان، اسمگلر چہرا اور دہشت گرد کا روپ تھا۔ وہ بولے، "آپ یہ کیجیے کہ لائن سے ایک طرف ہو جائیے اور مجھے دوسرے مسافروں کو کلیر کرنے دیجیے"

میں نے اپنی آنکھیں مل کر ان کی آنکھوں میں اپنا جھوٹا روپ دھو ڈالا مجھے ان ہی کے مکالمے سے راستہ سوجھ گیا۔ اور میں نے پرزور لفظوں میں کہا۔ "میں لائن سے نہیں ہٹوں گا اور نہ کسی اور کو آگے آنے دوں گا۔ جب میرا سارا معاملہ صاف ہے تو میں پیچھے کیوں جاؤں؟"

وہ مجھے لاٹھی نہیں مار سکتے تھے۔ معاملہ اتنا گمبھیر نہیں تھا کہ پولیس کو بلاتے۔ مجبوراً بولے۔ "اچھا پاسپورٹ لائیے میں ادھر آفس والوں سے چیک کرا کے آتا ہوں"

"واشے گو" میرے مونہہ سے نارویجین لفظ نکل گیا۔

انہیں غصہ کرنے کا بہانہ مل گیا۔ تڑک کر بولے۔ "کیا کہا؟"

"ناروے میں رہتا ہوں۔ اکثر نارویجین زبان بولتا ہوں۔ اچانک مونہہ سے نکل گیا ہے۔ مطلب ہے 'پلیز' چاہے تو اس کا بھی ترجمہ کروا لیجیے گا"

انہیں میرے فقرے میں طنز نظر آگیا۔ بڑبڑاتے ہوئے ایک طرف چلے گئے۔ پندرہ منٹ بعد آکر بولے "او کے میں آپ کو اپنے رسک پر بھیجے دیتا ہوں"

مجھے پولیس چیک اور میٹل ڈی ٹیکٹر سے گزارنے کے بعد میرا سامان ایکس رے مشین سے گزارا گیا۔ جب مشین نے بتایا کہ بریف کیس میں تو دسیوں کتابیں ہیں تو پھر سامنے کھڑا کر کے ایک ایک کتاب کا ایک ایک صفحہ پرکھا گیا کہ کہیں کسی کتاب کا کوئی صفحہ قلم کی بجائے پستول کی نال سے نہ لکھا پڑا ہو۔ جب ہر چیز نے اطمینان دلا دیا کہ بندہ شریف ہے اور خالص ویجیٹرین انسانی خون تو کیا، ٹڈے تک کا خون نہیں دیکھ سکتا، تو پھر بھی ایک سوال داغ ہی دیا گیا۔ "اتنی کتابیں؟ کس لئے؟ کیا جہاز میں پڑھے گا؟"

"جی، جہاز میں اور بغداد ایرپورٹ پر تو گھنٹے ٹرانزٹ کی قید بامشقت میں"

"کیا کام کرتے ہیں؟"

"جی قلم گھسا رہا ہوں"

"اوہ! ادیب ہیں۔ مگر روٹی کیسے کماتے ہیں؟"

پہلی بار ٹھیک سے پہچانا اور معقول سوال سے نوازا گیا تھا۔ جس میں ایک قابلِ قدر وجہ حیرت کی موجود تھی کہ ادیب ہوں تو پھر روٹی کیسے کماتا ہوں۔ میں نے جواباً عرض کیا۔ "یہ سب تو ذہن کی روٹی ہے۔ پیٹ کی روٹی کے لئے دوسرا دھندا کرتا ہوں۔ میں بینک میں ملازم ہوں"

"ٹھیک ہے۔ اب آپ جہاز پر سوار ہو سکتے ہیں" انہوں نے کمال مہربانی سے گیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا جہاں کچھ اور لوگ معائنے کے تیر و تفنگ لئے گیٹ پر چاق و چوبند کھڑے تھے۔

ہوائی جہاز کے دروازے پر پھر سارے جسم پر ہاتھ پھیر اگیا۔ کتابوں نے پھر بکھیڑا کھڑا کر دیا۔

"کتابیں؟" سٹے چیکر پھر چونکے جیسے ہر کتاب میں ایک ریوالور پوشیدہ ہو۔" جھنجھلا کر بولے اور رنئے سرے ایک ایک ورق کو جانچنے لگے۔ کہیں کوئی چھرا، چاقو یا پستول لفظوں کے گنجان آباد ذخیرے میں چھپا نہ بیٹھا ہو۔ ان کی کھوج کے بعد جب سب الفاظ اپنی شرافت ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے تو آگے بڑھنے کا اشارہ ملا۔ پھر اچانک انہیں کچھ یاد آ گیا۔ روکا اور بولے "پاسپورٹ"؟

پاسپورٹ پیش کیا گیا۔ دیکھ کر بولے "آپ رام سرن رانا ہیں یا رام سرن داس رانا؟"

"دونوں ہی ہوں"

"ایک آدمی دو کیسے ہو سکتا ہے؟"

"جیسے اب آپ کے سامنے کھڑا ہے۔ ایک قلمی نام ہے اور ایک عام نام ہے"

انہوں نے کچھ صفحات اور پلٹے۔ تصویر پر پہنچے۔ پھر مجھے اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تک دیکھا اور کہا۔

"او کے۔ جائیے"

اندر پہنچ کر اور سیٹ پر ڈھیر ہوتے ہی آنکھیں بند کر کے میں سوچنے لگا: وہ ایک آدمی ہے یا دو؟ یا زیادہ سے زیادہ چار پانچ۔ پھر وہ اچانک نمودار ہوتا ہے۔ ریوالور نکالتا ہے چلاتا ہے "ایک مسافر بھی ہلا جلا یا اُف کی تو گولی مار دوں گا۔"

وہ خود یا اس کا کوئی ساتھی پائیلٹ کے کیبن میں جاتا ہے اور پستول کی نال اس کی گردن پر رکھ دیتا ہے اور سب مسافروں کو بھیڑ بکریوں سے لدے ٹرک کی طرح جدھر چاہتا ہے، موڑے جاتا ہے۔ اور ہم ہزاروں ملکوں پر پھیلے کروڑوں شریف لوگ اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور خواہ مخواہ غلط قسم کی چیکنگ کے دشوار گزار مراحل سے گزرتے رہتے ہیں۔

لاؤڈ اسپیکر پر اناؤنسمنٹ نے مجھے چونکا دیا۔ "اب آپ کو ایک انڈین فلم دکھائی جائے گی۔ نام ہے "ہم سب چور ہیں"

اور اس سے پہلے کہ فلم شروع ہو، میں نے آنکھوں پر کمبل کھینچ کر آنکھیں اچھی طرح بند کر لیں۔ مجھے نہیں دیکھنی یہ فلم، کیونکہ میں چور نہیں ہوں۔ ❁ ❁ ❁

دریا اور کنارے

کنارہ: بچپن میں کھیلنے کودنے اور نئی نئی شرارتیں اختراع کرنے میں میرا کوئی ثانی نہیں تھا اور پڑھنا تو ایک طرف، کتابوں کو ہاتھ لگانا بھی مجھے بالکل پسند نہیں تھا۔ اور نہ ہی گھر پر سکول کا ملا کام کرتا تھا، بس جیسے تیسے اُسے سکول میں ہی گھسیٹ لیتا تھا۔ دراصل اُن وقتوں کے اُستاد کچھ پڑھاتے ہی اس طرح تھے کہ سب کچھ اپنے آپ ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ چونکہ میں کلاس کے بہت اچھے اور ذہین لڑکوں میں شمار ہوتا تھا اور امتحان میں بھی بنا پڑھے اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتا تھا اس لئے اُستاد یا والدین کتابوں کی طرف میری لاپرواہی کو نظر انداز کرتے تھے۔

دریا: جب میں ذرا بڑا ہوا اور زندگی کے دریا نے خود بخود مجھے کناروں سے اپنی لہروں میں کھینچ لیا تو زندگی جینے کے لئے مجھے ہاتھ پاؤں مارنے بھی آگئے کہ زندگی خود ایک بہت بڑا سبق بھی تھی اور اُستاد بھی۔ میں ابھی لڑکپن کی حدود میں ہی تھا کہ میرے ایک نئے شوق نے میرے گھر کے آنگن میں مجھ سے ایک امرود کا پیڑ لگوا دیا۔ اس پر جب پہلے پہل دو ننھی مُنّی کونپلیں پھوٹیں تو میرا دِل خوشیوں سے جھُوم اُٹھا۔ مجھے لگا جیسے میں ایک ننھے مُنّے خوبصورت سے بچّے کی ماں اور باپ بن گیا ہوں۔ میں اُسے بڑی باقاعدگی سے پانی دیتا۔ اُس کی ننھی مُنّی ہری ہری پتیوں کو چڑیوں کی خوراک بننے سے بچانے کے لئے اُن پر پناہ کی چھتری بنا ہر دم چھایا رہتا۔ میری دیکھ ریکھ میں آہستہ آہستہ اُس نے قد نکالنا شروع کیا۔ اَب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو چکا تھا مگر مجھے بے چین اور فکرمند ماں کی طرح ہر وقت اُس کی چنتا دامن گیر رہتی۔ اُس کی چڑھتی جوانی نے میرے دل میں خوشی بھری اور بہت سی فکریں اُجاگر کرنی شروع کر دیں۔ یہ کیسی اولاد تھی جو جوان ہو کر مجھے خوشی دینے کے ساتھ ساتھ فکرمند بھی کرنے لگی تھی۔ اب میرے دل میں ایک خوف ہر وقت جاگزیں رہتا کہ کہیں۔۔

اور ایک دن میرے دل کے ہَول نے اپنی اصلی اور بھیانک صورت اختیار کر ہی لی۔ میرے باپ کی غریبی کے ایک ہی جھٹکے نے ہمارے آنگن کا وہ حصّہ ہمارے پڑوسی کے حوالے کر دیا۔ تب مجھے لگا جیسے میرے جوان بیٹے کو کسی نے مجھ سے چھین لیا ہو مگر میں پھر بھی خوش تھا کہ میں کم از کم اپنے سامنے پھلتا پھولتا اور بڑھتا تو دیکھ سکتا

تھا۔ ایک دن صبح زور کی ٹھک ٹھک کی آواز سے میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا۔ پڑوسی میرے جوان نیم کی شہ رگ پر کلہاڑا چلا رہا تھا۔ میں نے اپنے باپ کی طرف رحم اور مدد طلب نظروں سے دیکھا مگر وہ بڑی بے بسی سے یہ کہتا ہوا اندر چلا گیا کہ پڑوسی وہاں اپنا ایک کمرہ بنانا چاہتا ہے۔ تب دن رات میرے ذہن پر غصّے کے حملے ہونے لگے۔ اور ایک رات میں نے خواب میں گنڈاسے کے ایک ہی وار سے اپنے پڑوسی کا کام تمام کر دیا۔

دِلوں کی تقسیم کے ساتھ ساتھ وطن کی تقسیم مجھے اُس دُکھ سے دُور میرے نئے وطن لے آئی اور شادی کے ایک نئے شگوفے نے میرے پچھلے تمام غموں اور دُکھوں کو چوس لیا۔ پھر میرے گھر آنگن میں ایک نئی کونپل پھوٹی۔ یہ ایک ننھا مُنا خوبصورت سا، پیارا سا بچّہ تھا۔ اُسے دیکھ کر مجھے لگا جیسے مجھے میرا اَمرود کا پیڑ واپس مل گیا ہے۔ میں پھر اُسی محبت اور لگن سے اُسے پالنے پوسنے اور بڑا کرنے میں دِل و جان سے جُٹ گیا۔ نجانے کب، کیسے اور کیوں ہم میاں بیوی میں ایک معاہدہ سا ہو گیا کہ ہمارا ایک ہی بچّہ ایک سَو کے برابر ہے۔ خود حکومت بھی یہی چاہتی تھی کہ عوام کم سے کم بچّے پیدا کرکے اُن کی اچھی سے اچھی دیکھ بھال کریں۔

اُسے دُنیاوی حادثوں سے بچاتے، پل پل بڑھاتے اور خود کو تِل تِل گھٹاتے ہم اُسے اُس اسٹیج تک لے آئے جہاں درخت پر پہلا بُور آتا ہے اور اُس کی اگلی اسٹیج ثمر آور ہونے کی ہوتی ہے۔ ہم نے بہت کچھ کھو کر جو کچھ پایا تھا وہ اتنا دِل خوش کن تھا کہ جسے دیکھتے ہی ہمارے تمام دِلدر اپنے آپ دُور ہو جاتے تھے۔ آخر ایک دن ایک بہت اچھے گھر کی لڑکی ہماری بہو بن کر ہمارے گھر آنگن کی رونق بڑھانے آ گئی۔ ہم جب اپنی بہو اور بیٹے کو ہنستے مُسکراتے دیکھتے تو ہمارے دِل کی کلی کلی کِھل اُٹھتی۔ ہمیں لگتا جیسے ہمارے پیڑ پر عنقریب کچھ اور خوبصورت پھل لگنے جا رہا ہے مگر اِس سے پہلے کہ۔

شاید تقسیم ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ شاید کہیں کوئی کسر رہ گئی تھی۔ شاید ہمارے لیڈروں سے کہیں کوئی بھول رہ گیا تھا۔ وطن کے درخت پر تقسیم کے کلہاڑے کا زخم شاید ابھی اچھی طرح بھرا نہیں تھا اور وہ اندر ہی اندر آہستہ آہستہ رِستا رہتا تھا۔ اور دونوں اطراف کے لیڈر اُسے گاہے بگاہے کچی مٹی سے لیپ کر گہری نیند سو جاتے تھے۔

ایک بار پھر میرے وطن کے اُوپر مذہبی جنون کے کالے اور بھدے گِدھ اپنی خوراک کی تلاش میں تلوار جیسی تیز چونچیں لئے منڈلانے لگے اور ایک شام پھر ایک کلہاڑا ـــــ میرا نوجوان بیٹا ہنستا مُسکراتا اپنی نوبیاہتا بیوی کے ساتھ اپنے ڈرائنگ رُوم میں ٹی وی پر کوئی فلم دیکھ رہا تھا کہ گلی کے اندھیرے سے کھڑکی کی راہ کسی نے اُس کے سر میں گولی مار دی۔ تب میری آنکھوں کے سامنے اُس کی زندگی کا ایک ایک پل، کسی شاندار عمارت کی ایک ایک اینٹ کی طرح اپنی جگہ سے اُدھڑنے، گرنے اور اپنی جگہ چھوڑنے اور اپنے ہی قدموں میں منہدم ہونے لگا۔ مجھے بڑے بھیانک خواب آتے، لگتا جیسے کوئی ظالم ہاتھ میرے ہی سامنے میرے اُس آنگن کے جوان اور ثمر آوری کے لئے تیار درخت کی ایک ایک پتی نوچتا، مسلتا، مروڑتا اور میرے ہی دِل کے گہرے اندھے کنوئیں میں ڈالتا جاتا ہے اور میں اِتنا بے بس ہوں کہ اُس کا ہاتھ مروڑنا تو ایک طرف اُسے روک تک نہیں سکتا۔

دُوسرا کنارہ : مگر آخر ایک دن میں فیصلے کے دوارے نکل ہی گیا۔ میں نے سوچ لیا۔ اَب میں اپنے بیٹے کے قاتل کی گردن پر خوابوں میں نہیں حقیقت کی دُنیا میں کلہاڑا چلا کر اور اپنی آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کر کے ہی دم لُوں گا۔ اور ایک دن سچ مچ میں نے اُسے گھیر ہی لیا۔ وہ بالکل وہی تھا، وہی رنگ رُوپ، وہی ملبُوس اور اُسی کا اہم مذہب۔ اکیلی سُنسان گلی میں وہ تنہا، نہتا اور میں پستول بردار۔ میں نے لبلبی پر اُنگلی رکھی ہی تھی کہ میرا ذہن ایک ایسے باپ کا ذہن بن گیا جس کے سکرین پر ایک فلم کی طرح ایک شاندار عمارت کھڑی ہو گئی جس کی ایک ایک اینٹ اپنی جگہ سے اُدھڑنے بکھرنے اور اپنی جگہ چھوڑنے لگی مگر سے دل نے فلم ری وائنڈ کے بٹن پر اُنگلی رکھ کر اُسے صحیح سلامت واپس اپنی جگہ پر کھڑا کر دیا میری اُنگلی ٹریگر سے ہٹ چکی تھی۔

بیٹے کی جواں مرگی کا دُکھ میری راتوں کی نیندیں حرام کئے رکھتا اور انتقام پر اُکساتا رہتا۔ انتقام کی آگ پر جھلستا بے چین و بے قرار آخر ایک دن پھر میں نے موقعہ پاتے ہی اُسے دبوچ لیا۔ وہی فلم ایک بار پھر میرے ذہن کے سکرین پر چلی مگر میں نے سختی سے سٹاپ بٹن پر اُنگلی رکھ دی۔ کچھ میرے مذہبی مقدس اسباق نے میرا راستہ روکا مگر میری وہی عادت آڑے آئی۔ آخر کالج کی تعلیم تک بھی تو میں نے کتابوں کو چھوا تک نہیں تھا۔ بلکہ اُنہیں نئے استادوں ہی کی پڑھائی میں پڑھا اور سمجھا تھا۔ اَب اگر میں سکھ تھا تو گرنتھ صاحب کو میں نے بالائے طاق رکھ دیا۔ اگر ہندو تھا تو گیتا کے گیان کو بھول گیا اور اگر مُسلمان تھا تو قرآن سے آنکھیں موڑ لیں۔ میں نے اپنے نئے اُستادوں اور لیڈروں سے اِن مقدس کتابوں کو جس طرح سُنا اور سمجھا تھا، اُن ہی کے سہارے اپنے نئے امتحان کے میدان میں کود پڑا۔ اور کامیابی و کامرانی نے بڑھ کر میرے قدم چوم لئے۔ میں نے پستول کی لبلبی پر اُنگلی دبا دی تھی۔

مارگزیدہ

اُسے سنہرے بالوں والی گوری میمیں سنگِ مرمر کی ایسی دیویاں لگتی تھیں، جنہیں محض مندروں میں سجانے اور اُن کے آگے دھوپ دیپ جلا کر پوجا کرنے کے لئے بنایا گیا ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ اُن میں سے کسی ایک سے شادی کر کے خود کمائے اور اُسے اندر ڈرائنگ روم میں شو پیس کی طرح بٹھا کر دیکھا کرے۔ اُسے عورت کا گھر بار چھوڑ کر باہر کمائی کے لئے جانا بالکل پسند نہیں تھا گھر بھی تو ایک مکمل اِدارہ ہوتا ہے۔ جسے عورت شادی کے بعد سے لیکر مرنے تک سنبھالتی رہتی ہے۔ جس میں کسی اتوار یا تہوار کی چھٹی بھی نہیں ہوتی۔ نہیں وہ اُسے ہر قسم کا آرام دے گا اور بہت زیادہ کام نہیں کرنے دے گا۔ عورت کے ذِمہ بچہ پیدا کرنے کا بوجھ بھی کوئی کم ذمہ داری نہیں۔

"گورو ہنس پدارتھ کے یُورپی بھگت اور بھگتنیں صبح شام کتنی شردھا سے گورو پُوجا کرتی ہیں۔ یہ پُوجا اُن کے دِلوں میں ہندوستان اور ہندوستانیوں کا کتنا بھرپُور پیار بھر دیتی ہے۔ اور وہ کسی بھی ہندوستانی سے شادی کرنے کو باعثِ فخر و انبساط خیال کرتے ہیں۔ للی کو سمیر میں ایسا ہی آئیڈیل نظر آیا تھا اور وہ تنکے کی طرح اُس کی طرف کھنچی آئی تھی۔ سمیر چند دوستوں کے ساتھ محض تماشہ دیکھنے اُن کے آشرم میں گیا تھا۔ پرشاد کے بعد شام کو اُن کے ڈانس کلب میں ناچتے ہوئے اُس کا دِل للی کے دِل میں جاگزیں ہو گیا تھا۔ للی نے اُسے اپنے فرقے کا بھگت بنانے کے لئے اُس کے گلے میں رُدرا مالا ڈالی تھی۔ جسے اُس نے اپنے عشق کے جنون میں ور مالا سمجھ لیا تھا۔ واقعی عشق اندھا ہی تو ہوتا ہے۔

شادی کے بعد اُسے دُنیا چاروں طرف کھلکھلاتی اور قہقہے لگاتی محسوس ہونے لگی تھی۔ للی بھی اَب ایک کلی سے مکمل پھول بن گئی تھی۔ بھرپُور اور گھر کے کونے کونے میں پھیلتا، مُسکراتا اور خوشبوئیں بکھیرتا ہوا۔

للی کے حُسن میں اپنی چاند جیسی بہو کے خوابوں کی تعبیر پا کر ماں کتنی خوش ہو گی، یہ سوچتا ہوا وہ ایک دِن للی کو لئے پنجاب پہنچ گیا۔ پنجاب جہاں کبھی محبت کرنے والوں کے عشق ناکام ہوئے تھے۔ وہ اُسی پنجاب کو اپنے کامیاب عشق کی جھلک دِکھلائے گا۔ تو للی کے حسنِ جہاں سوز سے سب کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔

"کتنا خوبصورت ہے تمہارا پنجاب۔ ہرے بھرے کھیتوں اور کھلی دھوپوں کا ملک۔" للی نے جھوم کر کہا تھا۔

"جی چاہتا ہے اِن ہی کھیتوں کی ہریالی میں ناچتے گاتے ساری عمر گذار دوں"

اُس نے جب للی کی بات کا ترجمہ ماں کو بتایا تھا تو وہ اِس خیال سے جھوم اُٹھی تھی کہ اُس کی بہو اور بیٹا اب اُس کے پاس رہیں گے۔ خود سمیر کو بھی للی کی خواہش بہت پسند آئی تھی۔ دوسرے ہی دن وہ ماں کے ساتھ اپنے کھیتوں میں گیا تھا اور للی کو ہرنی کی طرح پگڈنڈیوں پر چوکڑیاں بھرتے دیکھا تھا تو اُسے بہت اچھا لگا تھا مگر یہ خوشی اکیلے اُس کے حصّے میں نہیں آئی تھی بلکہ سارا گاؤں ہی اُس کی اس خوشی کا حصّہ دار بن گیا تھا۔ وہ کھیتوں میں جاتی تو ہل چلاتے کسان ہاتھ روک کر للی کو دیکھتے ہی رہ جاتے۔ کئی نوجوانوں کو اب اُنکے رہٹ کا پانی دوسرے سب کنوؤں سے میٹھا لگنے لگا تھا۔ سمیر اور اُس کی ماں للی کو کوئی کام بھی نہیں کرنے دیتے تھے۔ بس وہ اِدھر اُدھر ایک ایک پودے کو حیرانی سے دیکھتی گھومتی۔ دور نکل جاتی تو گاؤں کے لوگ اُسے دیکھتے ہی رہ جاتے۔ پہلے پہلے سمیر کو یہ تاک جھانک وقتی لہر محسوس ہوئی تھی مگر آہستہ آہستہ یہ نظریں خود اُس کے اپنے جسم پر چبھنے اور اُسکے دل کو چھلنی کرنے لگیں۔

شام کو للی بیل گاڑی پر لدے گھاس کے ڈھیر پر بیٹھ کر گھر لوٹتی تو گاؤں میں گھستے ہی پیچھے بچوں کی قطاریں ساتھ ساتھ چلنے لگتیں جیسے چند روز کے لئے اُن کے گاؤں میں اُتری پری کو اُسکے واپس اُڑ جانے سے پہلے اُنہوں نے دیکھ نہ لیا تو اُنکے اندر کوئی حسرت بھری کمی باقی رہ جائے گی۔

ایک دن جوانی کے مست اور البیلے گھوڑے پر سوار اجیت سنگھ نے مذاقاً اُسے کہہ ہی دیا۔ "سمیر یہ ہرنی کہاں سے شکار کر لائے ہو۔ شام کو پکانا تو ایک ٹکڑہ ہمیں بھی بھیج دینا۔ صرف خوشبو سے مت رُلا دینا"

کافی دیر اجیت سنگھ کی ہنسی اُسے اپنے ذہن میں برمے کی طرح چھید کرتی محسوس ہوتی رہی۔ اُسی دن اُس نے للی سے کہہ دیا۔ "للی تم کل سے کھیتوں میں نہیں جاؤ گی"

"کیوں؟"

"لوگ تمہیں اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے"

مغربی حسینہ کو اچھی اور بُری نظروں کے فرق کا علم نہیں تھا۔ بولی "وہ مجھے پسند کرتے ہیں، ہائے کتنی پیاری نظروں سے دیکھتے ہیں"

"یہ دوسری قسم کا معاشرہ ہے۔ اِسے پیار نہیں، بُری نظر کہا جاتا ہے۔ بس کل سے تم گھر پر رہو گی" اُس نے بڑی سختی سے اُسے کھیتوں کی طرف آنے سے منع کر دیا۔ "ٹھیک ہے میں تمہارے لئے کھانا بنا کر وہاں لاؤں گی" اُس نے ساس سے تھوڑا بہت کھانا بنانا سیکھ لیا تھا۔ زیادہ تر تو بڑھیا اُسے چوکے میں گھسنے ہی نہیں دیتی تھی مبادا بہو کے ہاتھ میلے نہ ہو جائیں۔ اَب وہ اس موقعے کا پُورا فائدہ اُٹھانا چاہتی تھی۔

"تم کھانا بنا رکھنا۔ دوپہر کو میں خود ہی آکے لے جاؤں گا" وہ نہیں چاہتا تھا کہ للی اکیلی کھیتوں کی طرف آئے۔

دوسرے دن دوپہر کو جب کھانا لینے وہ گھر پہونچا تو یورپ میں کھلی دھوپوں کی ترسی للی جیسے تیسے کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر اُوپر چھت پر چٹائی بچھائے اَدھ ننگی لیٹی دھوپ سینک رہی تھی۔ اُسے گاؤں میں اس حالت میں دیکھ کر وہ لرز

گیا۔ آس پاس کی چھتوں پر لڑکے بالے ایسے منڈیروں پر چڑھے بیٹھے تھے جیسے سرکس کے چکّر کے آس پاس تماش بین دائرہ بنائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ سمیر کو دیکھ کر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اُن میں سے ایک شرارتی لڑکے نے کہا: "اُو سمیر بابا۔ میم تو کھنے ڈال رکھی ہے؟" اور سب ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

پہلی بار سمیر کو لِلی کا سُرخ و سفید جسم کھیتوں میں پڑے اُس مرے ہوئے جانور کا لوتھڑا سا جسم محسوس ہوا جس کی کھال گاؤں کے چمڑہ کمانے والے موچی اُتار کر لے جاتے ہیں اور اُس کے ننگے جسم کو نوچنے کے لئے کوّے گِدھ اور کُتّے دائرہ بنائے گھیرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اُس نے ماں کو جیسے تیسے منا کر اور چھوٹے بھائی کے شہری کچی نوکری چھوڑ کر واپس آ جانے کا لالچ دے کر لِلی کے ساتھ واپس جرمنی کی طرف پر تول لئے۔

پہلی بار جب لِلی کا پیر بھاری ہُوا تو وہ بہت خوش ہوا۔ "لِلی تم گھر پر رہو اور آرام سے بچّے کو پلتے بڑھتے دیکھو۔ تمہیں تو گاؤں میں ننھے مُنّے پودوں کو بھی بڑھتے پھلتے دیکھنے کا کتنا شوق تھا۔"

دُوسرے ہی دن وہ گھر کو ماں بننے والی عورت کے مذاق کے مطابق سجانے اور سنوارنے میں دل و جان سے جُٹ گیا مگر چند ہی ہفتوں بعد لِلی نے کوئی گرم دوا کھا کر اُس کی تمام اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ جیسے تیسے یہ کڑوا گھونٹ بھی برداشت کر گیا مگر جب لِلی نے حمل نہ ٹھہرنے کی باقاعدہ دوا کھانی شروع کی تو ایک دن وہ شعلے کی طرح بھڑک اُٹھا۔ "نہیں میں تمہیں یہ نہیں کرنے دُوں گا۔"

"تم ہوتے کون ہو، میری ذاتی آزادی میں دخل دینے والے۔ تم چاہتے ہو، تمہاری خودغرضی کے لئے اپنے سارے فِگر کا ستیاناس کر لُوں۔ کان کھول کر سُن لو میں تمام عمر یہ جھنجھٹ پالنا ہی نہیں چاہتی۔" لِلی نے اُس سے زیادہ تُرش اور چیختے الفاظ میں کہہ دیا۔

اُس دن وہی آسمانی مخلوق، اِندر کے اکھاڑے کی اپسرا اور دیوی لِلی اُسے وہ ڈائن لگی جو اپنے ہی بچے چٹ کر جاتی ہے۔ لِلی نے یہیں پر بس نہیں کی بلکہ شام کو باقاعدہ پھر سے گوری بھائیوں کی محفلوں میں جانے لگی جو بھائی کم، اور ناچ چلم، حقہ اور بستر کے ساتھی زیادہ تھے۔ تنگ آ کر اور کچھ دے دِلا کر اُس نے لِلی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارہ حاصل کر لیا اور یہ سب کچھ اتنی جلدی اور آسانی سے ہو گیا جیسے اُس سے زیادہ خود لِلی اُس کی بندشوں اور قیدوں سے آزاد ہونا چاہتی تھی۔

کچھ ہی عرصہ میں اُس کا فرینکفرٹ میں بزنس خوب چمک اُٹھا مگر دولت، کار اور کوٹھی بھی اُسے زیادہ دیر خوش نہ رکھ سکے اور عورت کے بغیر گھر کا سُونا پن اُسے کھانے کو دوڑتا محسوس ہونے لگا۔ اُس نے سوچا اب وہ ایک نہایت حسین پڑھی لکھی اور اپنی ماں کی تابعدار ہندوستانی بیوی لائے گا۔ اور چند دوستوں کی رائے پر اُس نے دہلی جا کر ہندوستان ٹائمز میں ضرورتِ رشتہ کا اشتہار دے دیا اور خود جواب کے انتظار میں ایک اچھے سے ہوٹل میں قیام پذیر ہو گیا۔ بزنس مین اور وہ بھی جرمنی جیسے ملک میں ہفتہ بھر میں اُس کے سامنے خطوں اور فوٹوؤں کا ڈھیر لگ گیا۔ اُن میں سے آٹھ دس رشتے اُس نے ملاقات کے لئے چُنے۔ انٹرویوز، ملاقاتیں اور باتیں۔ چوتھی ہی لڑکی پر وہ اس قدر فریفتہ ہوا کہ باقی تمام خطوط

اور فوٹوز اُس نے ایک طرف ڈال دئے۔ لڑکی تھی کہ کوئی چھلاوہ۔ سُندر تا میں تو ہر زاویے سے مکمل۔ عقل میں ہر طرح سے لاجواب۔ تعلیم بہت اعلٰے۔ اُس کے پاس سمیر کے ہر سوال کا جواب دست بدست موجود تھا بلکہ کبھی تو سوال ابھی آدھا ہی نہ ہو پاتا کہ جواب کھٹاک سے حاضر کر دیا جاتا حتیٰ کہ وہ اپنے ساتھ اپنے وزن کا کارڈ، قد کی لمبائی، جو پہلے ہی سرو قد تھی اور ڈگریاں تک بھی لے آئی تھی۔ وہ ٹاپ اور شارٹ ہینڈ بھی جانتی تھی مگر اُسے ہاؤس وائف بن کر رہنے کی زیادہ خواہش تھی۔ ہاں خاوند کی بزنس میں کبھی کبھی مدد کر دینے پر اُسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کے ایک جواب پر تو سمیر عش عش کر اٹھا۔

"آپکے ساتھ اور کوئی نہیں آیا۔ آپکے ماں باپ؟ کوئی رشتہ دار؟؟"

"بہت بھرا پُرا گھرانہ ہے مگر یہاں یہ سوچ کر اکیلی آئی ہوں کہ اپنے پتی سے ملنے جا رہی ہوں۔ وہاں کسی تیسرے کا کیا کام۔"

"پتی؟ آپکو کیسے پتہ تھا کہ میں آپ ہی کا انتخاب کرونگا۔" سمیر نے اُسے باقی خطوط اور تصویروں کا ڈھیر دکھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھئے سمیر صاحب۔ آپ بھی تو اکیلے آئے ہیں۔ آپکے ذہن میں کوئی لڑکی آپکی بیوی بن چکی ہے اسی طرح میرے ذہن میں بھی کوئی لڑکا میرا پتی بن چکا ہے۔ آپ کو دیکھ کر اگر میری خیالی تصویر اپنا اصلی روپ نہ دھار لیتی تو میں ہرگز آگے نہ بڑھتی۔ دروازے پر سے ہی لوٹ جاتی۔"

"کیا تم بچے پسند کرتی ہو؟ اور کتنے؟؟"

"بچے کے بغیر عورت کی تکمیل ہو ہی نہیں سکتی۔ کتنے؟ یہ میاں بیوی کا آپسی معاملہ ہے مگر میں یہ ضرور کہوں گی کہ وہ اتنے زیادہ نہیں ہونے چاہئیں کہ عورت صرف ماں بن کر رہ جائے اور خاوند کو بیوی کا سُکھ نہ دے سکے۔"

"میں باہر رہتا ہوں۔ چل سکو گی۔"

"ہاں ــــ سیتا تو رام کے ساتھ بنوں میں چلی گئی تھیں مگر اس سے پہلے میں اپنے ساس سسر سے ضرور ملنا چاہوں گی۔"

شادی کے بعد سمیر جب اُسے ماں کے پاس لایا تو رجنی نے بڑھ کر اُسکے پیر چھوئے۔ پھر سمیر سے پوچھا "پتا جی کہاں ہیں؟"

سمیر اُسے دوسرے کمرے میں لے گیا، جہاں دیوار پر اُس کے باپ کی تصویر پر پھولوں کا ہار پڑا تھا۔ "اوہ" رجنی پل بھر کے لئے اُداس ہو گئی۔ پھر اُس نے سر پر پلّو لے کر بڑی عقیدت سے پرنام کیا اور اُن کے پاؤں چھو کر اُنگلیاں ماتھے سے لگا دیں۔

ہفتہ بھر رجسٹریشن وغیرہ کے اور دوسرے ضروری کاغذات سنبھالے وہ جرمنی پہنچ گئے۔ دو ہفتے ہنی مون مناتے فرانس، سوئٹزرلینڈ اور انگلینڈ وغیرہ کی سیریں کرتے گذر گئے۔ اس کے بعد سمیر نے رجنی کی جرمنی میں رہائش کے لئے کاغذات جمع کروا دئے۔

رجنی کی آمد سے گھر کا کونہ کونہ کسی باسلیقہ اور وفا شعار بیوی کے آجانے کا مظہر بن گیا تھا۔ شام کو وہ بنی ٹھنی دروازے پر ہی سمیر کی منتظر ملتی۔ اُسکی کمر پر ہاتھ رکھے وہ اُوپری منزل پر پہونچتا تو کچن میں کھانے کی خوشبوئیں اُس کی بھوک کو کئی گنا چمکا دیتیں اور وہ ٹوٹ کر جی بھر کر سیر ہو کر کھاتا۔ پھر ویڈیو پر کوئی انڈین فلم دیکھی جاتی۔ گپ شپ ہوتی یا کبھی کبھی تبدیلی کے لئے باہر کسی ریسٹورنٹ میں کھانا کھا لیا جاتا۔ اب رجنی کو بھی جرمنی میں قیام کی اجازت مل گئی تھی۔ وقت بہت اچھا گذر رہا تھا مگر وقت بڑا ظالم ہے کبھی کبھی انسان کو یوگا کا مشکل ترین آسن، شیرس آسن بھی کروا دیتا ہے، جس میں سر کے بل کھڑا ہونا ہوتا ہے۔ یہ آسن صحت

کے لئے بہت مفید ہے مگر اس کی زیادتی نقصان دہ بھی بہت ہے۔ سمیر کی زندگی میں بھی وقت نے اُلٹی قلابازی لگائی تھی۔ واپس آجاتا تو بھی کوئی بات نہیں تھی مگر وہ تو قلابازی کے ایک پوز میں تھم کر رہ گیا تھا۔ اُلٹے کا اُلٹا۔

ایک دن صبح جب رجنی گہری نیند کی آغوش میں گم تھی تو بیڈ روم کی سائیڈ ٹیبل پر اُس کا ایک خط سمیر کے ہاتھ لگ گیا جو رجنی نے شاید کل دن کو لکھا تھا اور آج پوسٹ کرنا تھا۔ سمیر نے رجنی کے جاگنے سے پہلے اپنے گھر کی پرائیویٹ کاپیئنگ مشین پر اُس کی ایک فوٹو کاپی بنا کر اپنے پاس رکھ لی۔ لکھا تھا۔

ڈیئر رومیش جی!

مجھے اب یہاں رہائش کا ویزا مل گیا ہے۔ بس چند مہینوں کی قید اور ہے۔ پھر میں آپ کو یہاں بلواؤں گی۔ ننھے بٹو کے لئے دِل بہت اُداس ہے۔ اُف کتنی بڑی جُدائی ہے اپنے بچے اور پتی سے مگر کیا کیا جائے۔ یہ سب کچھ آپ کے لئے آپ کی مرضی اور رائے پر ہی تو کر رہی ہوں۔

بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ وہ ہمیں جلدی ملوائے۔

آپ کی اپنی!

رجنی

چہرہ تو دِل کا آئینہ ہوتا ہے۔ دِل خوش نہ ہو تو آئینے پر شگفتگی کہاں سے آسکتی ہے۔ ایک دن رجنی نے سمیر سے پُوچھ ہی لیا۔ "کیا بات ہے آپ کئی دِن سے بدلے بدلے لگتے ہیں؟" پھر مسکرا کر ایک ادائے دلبری سے بولی۔ "کیا مجھ سے دِل بھر گیا ہے؟"

سمیر کو اب اور زیادہ اداکاری کرنی اچھی نہ لگی۔ وہ پہلے ہی بہت دُکھ جھیل چکا تھا۔ اُس نے رجنی کا خط اُس کے سامنے رکھ دیا۔ ایک بار رجنی کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور گُذر گیا۔ پھر وہ سنبھلی۔ ہنس کر بولی۔ "شاید آپکو معلوم نہیں میں کہانیاں بھی لکھتی ہوں۔"

"دیکھو۔ زیادہ بہانے مت بناؤ ورنہ تمہارا سارا پروجیکٹ فیل ہو جائے گا یا کم از کم (DELAY) تو ضرور ہو جائے گا۔"

"اوہ — آپ تو . . . !" رجنی نے رُوٹھنے کے انداز میں اُس کے گلے میں اپنی گوری گوری باہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں!" سمیر نے آہستہ سے اُس کی باہیں اپنے گلے سے نکالتے ہوئے کہا۔ "میں شکّی مزاج نہیں ہوں۔ اور تم نے کوئی کہانی وغیرہ بھی نہیں لکھی۔ خط ہی لکھا ہے اور وہ کسی ایڈیٹر کو نہیں مسٹر رومیش کمار کو ہی دہلی کے پتہ پر پوسٹ کیا ہے۔ میں نے خط پر پتہ چیک کرنے کے بہانے اپنے قریبی ڈاکخانے سے معلوم کر لیا ہے۔ فکر نہ کرو۔ تمہارا خط ٹھیک ٹھاک مکتوب الیہ کو پہنچ جائے گا۔"

اب رجنی کے لئے مکرنے کا اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ اُسے بتانا ہی پڑا۔ "رومیش چاہتے تھے کہ ہم کسی طرح کہیں باہر پہنچ جائیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے محلّے کے کتنے اَن پڑھ لڑکے فارن پہنچ کر پیسے اور دوسرے کئی معاملات میں ہم پڑھے لکھوں کو میلوں پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔" سمیر ہمہ تن گوش سُنتے جا رہا تھا۔ "میں نے کہا۔ رومیش تم کسی گوری میم سے

شادی کر کے ہی بعد میں طلاق دے کر مجھے بُلا سکتے ہو۔ ہمارا ایک پڑوسی خود اسی طرح ڈنمارک میں سیٹ ہوا ہے۔ رویش ابھی سسٹم تو بہت زیادہ ہیں مگر وہ اتنی بڑی چھلانگ لگانے کو تیار نہیں تھے کیونکہ اُنکی جاب مجھ سے کئی گنا بہتر ہے۔ وہ بولے اِس سلسلے میں تو میرے چانسز زیادہ ہیں۔ بڑا بننے کے لئے تھوڑی بہت قربانی تو دینی ہی پڑتی ہے۔"

"اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

"ننگی ہو جانے کے بعد اب میرے کیا ارادے رہ گئے ہیں بس آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔"

"صاف صاف کہو۔ کیا چاہتی ہو؟" سمیر اب ایک پَل بھی اُسے اور برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا۔

"آزادی۔" رجنی نے آنکھیں زمین پر گڑھائے ایک ہی لفظ میں دِل کی بات اُگل دی۔

سمیر کے لئے یہ زخم بہت گہرا تھا جو اپنے آپ نہیں بھر سکتا تھا۔ اُسے سلائی کی ضرورت تھی۔ سلائی سے زخم بند تو ہو جاتے ہیں مگر پھر بھی ٹھیک ہوتے ہوتے ایک طویل عرصے جاتے ہیں اور جاتے جاتے اپنے پنجوں کے نشان بھی چھوڑ جاتے ہیں۔

سمیر کے معاملے میں وقت شیرس آسن میں سر کے بل کھڑا کھڑا شاید تھک گیا تھا۔ وہ پھر سیدھا ہونا چاہتا تھا۔ وقت سب سے بڑا اداکار ہے۔ ہیرو کے پوز میں وِلن کا اور وِلن کے رُوپ میں ہیرو کا پارٹ پلے کر جاتا ہے جانے سمیر کے ساتھ وہ کون سا کھیل کھیلنا چاہتا تھا اچانک ایک محفل میں اُسے ایک ایسے جوڑے سے ملنے کا اتفاق ہوا جو صحیح معنوں میں ہر قسم کے دیکھ دکھاوے سے دُور تھا۔ سادہ دل سادہ لوح اور سادہ پوش۔ نہ کھانے پینے کا لالچ، نہ گپّوں اور بڑی بڑی ڈینگوں کا شوق اور نہ پلٹنے چپکنے کی عادت اپنا دیرلگائی ہر قسم کی بندشوں کو بھول کر سمیر ایک مُدت بعد اُن کی دعوت پر اُن کے گھر چلا گیا۔

مسز اینڈ مسٹر سیٹھی جیسے باہر نظر آئے تھے، ویسے ہی اپنے گھر بھی نظر آئے۔ اکثر لوگ اپنے گھر میں کتنے ہی گندے کیوں نہ رہتے ہوں باہر خوب بن ٹھن کر نکلتے ہیں مگر یہ جوڑا اندر باہر سادگی، صفائی اور شرافت کا دِلکش نمونہ تھا اور ان کے گھر کا ماحول بھی نہ صرف ہندوستانی تھا بلکہ اِتنا سادہ اور صاف سُتھرا جیسے ہندوستان کا کوئی ماڈل ہاؤس دیواروں پر اجنتا کی غاروں کی وال کارپِٹس شیلفوں پر کتابیں اور ہندوستان کے ہر صوبے کی گڑیا نما دُلہنیں اپنے مکمل صوبائی ملبوسات اور زیورات سے سجی دھجی۔ ڈیکوریشن پیسز بھی ایسے کہ جن سے ہندوستانیت ہر زاویے سے جھلک مارتی ہو۔ ڈرائنگ رُوم میں نہ کوئی کُرسی، نہ صوفہ، بلکہ دریاں اور ان پر بھی چاندنیاں اور موٹے موٹے گول سرہانے صاف سُتھری اولاد، دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ ساری فیملی کے شوق بھی ہندوستانی، پہناوے بھی ہندوستانی۔ بڑی لڑکی انڈین کلاسیکل رقص کتھک کی ماہر جب ناچتی تو گھر کے پودوں کے پتے تک ساتھ رقص کرتے محسوس ہوتے۔ دوسری سِتار بجاتی تو گھر کے پودوں کے وہی پتے تالیاں بجانے لگتے۔ لڑکا بانسری بجاتا تو ہندوستان کے پہاڑوں اور ریگستانوں میں بجتی بانسریوں کا سماں بندھ جاتا۔

اُسے ریتو کا بہت پسند آئی۔ خاص طور پر ناچتے ہوئے تو وہ کسی دوسرے ستارے کی مخلوق محسوس ہوتی جو کسی وشوامتر کی تپسیا بھنگ کرنے کو دھرتی پر اُتر آئی تھی اور اُس نے واقعی سمیر کے دِل میں ہل چل مچادی تھی۔ اُسے لگتا جیسے

وہ اسی کی تلاش میں اَب تک بھٹکتا رہا تھا۔ شاید وہ ایسا پھول تھی جس تک پہنچنے کے لئے اُسے راستے کے کانٹوں کی چبھن برداشت کرنی پڑی تھی۔ پھول ہاتھ لگ جائے تو پھر کانٹوں کی چبھن کسے یاد رہتی ہے۔

سمیر کے پاس بے انتہا پیسہ تھا اور رینو کا کے پاس اُسے خرچ کرنے کے بے شمار طریقے تھے۔ کلب، ڈانس، ڈرنک اور سیر یں۔ اُنکے ماں باپ کی حد سے زیادہ سادگیاں اور بندشیں اَب اپنی راہِ فرار تلاش کر رہی تھیں۔ سمیر خود اُسے کسی قسم کی قید و بند میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ ایک دِن وہ ضرور واپس اپنی جڑوں کی طرف لوٹے گی۔ ویسے بھی اُس کی آمدنی کے مقابلے میں رینوکا کی تمام فضول خرچیاں آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھیں۔

کھیل بہت ہو چکا۔ سمیر نے سوچا۔ اب اُسے رینوکا کو قریب بھی لانا اور خود اُسکے قریب جانا چاہئیے اور اُس ایک دن ...... مگر وہ بُولی: "پہلے ...... "! ٹھیک ہی تو ہے۔ باہر رہ کر بھی اُن کے گھر میں سو سال پُرانا ہندوستان بستا ہے تو شادی سے پہلے اُس سے کیسے کسی ایسی ویسی بات کی اُمید کی جا سکتی ہے۔ سمیر نے دِل کو سمجھایا اور کسی مناسب موقعے کے انتظار میں رہنے لگا جب وہ اُس کے ماں باپ سے اُس کا ہاتھ مانگ سکے۔ اَب رینوکا دِن بدن اُس کے اَور قریب آ رہی تھی مگر ایک احتیاط کے ساتھ کہ اَب وہ اگر کبھی رات سمیر کے ہاں رہ بھی جاتی تو اپنی ایک سہیلی ترپل کو ساتھ رکھتی یا اپنی ڈیفنس لائن مضبوط ہو جانے کے بعد اَب وہ اپنی اکثر راتیں سمیر کے ہاں گذارنے لگی تھیں۔

پچھلے تین ماہ سے میاں بیوی سیٹھی ہندوستان میں ڈٹے بیٹھے تھے۔ رینوکا نے کہا۔ "میرے لئے کوئی لڑکا ڈھونڈنے گئے ہیں مگر میں ...... اور دیکھ لینا وہ پہلے کئی بار کی طرح اِس بار بھی ناکام لوٹیں گے۔ ہم باہر رہنے والوں کی سچی ہندوستانیت کو بھی وہاں لوگ شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور خاص طور پر لڑکیوں کے معاملے میں تو وہ بہت تنگ دِل ہو جاتے ہیں"۔

تین مہینے بعد وہ لوگ ناکام واپس آئے تو اُن کی ناکامی سمیر کی خوشی کا سامان بن گئی۔ اب وہ ضرور اُسے بطور داماد قبول کر لیں گے۔ اُس نے سوچا اور اُس نے بات چلانے کے لئے اُنہیں اگلے ویک اینڈ پر اپنے گھر مدعو کر لیا۔ مگر وقت ایک بار پھر چمگادڑ کی طرح قلابازی کھا کر اُلٹا ٹنگ گیا۔ اُس سے دو دِن پہلے ہی رینوکا اور ترپل اُس کے سامنے درخواست گُناں آ کھڑی ہوئیں: "سمیر صاحب۔ ہم دونوں آپس میں شادی کر رہی ہیں۔ اپلیکیشن دے دی ہے۔ بطور بیسٹ فرینڈ آپ ہمارے گواہ بنیں گے نا؟"

حالات سے سمجھوتہ کرتے ہوئے سمیر نے سوچا اگر تقدیر نے میرے ہاتھ پر بیوی کی لکیر بنائی ہی نہیں تو کیا ضروری ہے کہ ہر بار تقدیر ہی کا سہارا لیا جائے۔ کیوں نہ تقدیر کا دامن جھٹک کر تدبیر کی کوئی راہ نکالی جائے۔ کہتے ہیں جہاں چاہ وہاں راہ۔ صاف موسم کے ایک خوشگوار دِن اُس نے گلی میں بچوں کو شور مچاتے دیکھا تو وہ بھی برفوں کے بعد کی پہلی کُنکُنی اور نرم ملائم، نیم گرم دُھوپ کا لطف لینے باہر نکل آیا۔ اُس نے دیکھا ایک چھوٹی سی بچی پریم میں ربڑ کے ایک ننھے سے گُڈے کو لئے جا رہی تھی اور اپنے خیالوں میں اُس کی ماں بنی اُس سے باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔ "آج موسم بہت اچھا ہے۔ تمہیں باہر گھما لاتی ہوں پھر گھر واپس جائیں گے تو تمہیں دُودھ پلاؤں گی پھر لوری سُن کر تم آرام سے سو جانا"۔

تدبیر کا پنچھی کئی دِن اُس کے ذہن پر ٹھونگیں مارتا رہا۔ ایک دن شہر کے ایک بہت بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور کے

بچوں کے سیکشن میں اچانک اُس کی نظر ایک فٹ سائیز کی ربڑ کی ایک ایسی گڑیا پر پڑی جو ماحول کے تمام لوازمات سے سے اپنے گھر کے ننھے منے ڈرائنگ رُوم میں صوفے پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ بابی کا سیلپنگ رُوم، باتھ روم، ڈائینگ ٹیبل، کچن، سٹڈی، ہر جگہ وہاں کے ضروری لوازمات سے ہر طرح مکمل تھی جس میں زندگی قدم قدم پر رستی بستی اور ہمکتی محسوس ہوتی تھی۔

اچانک تدبیر کے پنچھی کی آخری ٹھونگ نے اس کی سوچوں کے سارے دروازے وا کر دئے۔ وہ کھلونا سیکشن کے انچارج سے ملا۔ "کیا آپ قد آدم سائیز کی بابی بھی مہیا کر سکتے ہیں ؟"

"نہیں۔" ساتھ ہی اُس نے بابی بنانے والی کمپنی کا ایڈریس دیتے ہوئے کہا۔ "آپ کمپنی سے پتہ کرلیں۔ شاید وہ بنا سکتے ہوں۔"

قد آدم بابی کو اُس کی کار میں بٹھانے کے بعد کمپنی کے آفیسر نے ہاتھ ملاتے اور مُسکراتے ہوئے سمیر سے کہا۔ "مسٹر سامیز گُڈ بائی اینڈ گُڈ لک۔"

آفیسر جب بابی کو اُٹھائے اُس کی کار کی طرف آ رہا تھا تو سمیر کو ایسے لگ رہا تھا جیسے اُس کا سالا اُسکی دُلہن کو پنجابی رواج کے مطابق اپنے بازؤوں پر اُٹھائے بڑے پیار اور عزت سے ڈولی میں بٹھانے اور وداع کرنے آ رہا ہے۔ آفیسر کے آخری الفاظ بھی جیسے اُسے بہن اور بہنوئی کو آشیرواد دیتے ہوئے سے محسوس ہوئے تھے اُسے لگا جیسے وہ دُولھا بنا راجکمار کسی شہزادی کو بیاہ کے لئے جا رہا ہے۔ اور اُسے آس پاس شہنائیاں سی بجتی محسوس ہوئی تھیں۔

کار کی سیٹ بیلٹ کو بابی کے جسم پر باندھتے ہوئے اُسکے ہاتھ اچانک اُسکی چھاتیوں سے چھُو گئے تو وہ بے طرح شرما کر رہ گیا۔ راستہ بھر اُسے لگتا رہا جیسے ہوائی گھوڑے پر سوار وہ جنت کی کوئی حُور خود اُس کی اپنی مرضی سے اغوا کئے جا رہا ہو۔ اُس کی تیز رفتاری اور غلط ڈرائیونگ پر دوسری کاروں والوں نے اُسے زور زور سے ہارن دے کر اُس کی غلطیوں سے آگاہ بھی کیا۔ وہ بار بار سنبھلا بھی مگر پھر غلط ڈرائیونگ کرنے لگا۔ جیسے تیسے وہ گھر پہنچا خوش قسمتی سے اُس کا گھر بند سڑک کے آخری سرے پر تھا جس سے محلہ والے اُس کی حرکات و سکنات نہیں دیکھ سکتے تھے ورنہ شاید لوگ اُسے پاگل ہی سمجھ بیٹھتے۔

اُس نے بٹن دبایا تو بیلٹ نے اپنے آپ کھُل کر بابی کے جسم کو آزاد کر دیا۔ اس نے پہلے گھر کا دروازہ کھولا۔ اُسکی چوکھٹ پر تھوڑا سا سرسوں کا تیل گرایا اور پھر بابی کو ہاتھوں پر اُٹھا کر اندر لے آیا۔۔ "بابی ڈارلنگ میری ماں یہاں ہوتی تو وہ بھی یہی کرتی۔ نئی دُلہن کے چوکھٹ اُلانگنے سے پہلے اُس پر سرسوں کا تیل ڈالتے ہیں۔ ماں کہتی ہے اِس سے گھر میں بہت برکت پڑتی ہے۔"

ڈرائنگ رُوم میں اُسے صوفے پر بٹھاتے ہوئے وہ بولا، "ڈارلنگ۔ یہ تم نے کیسا لباس پہن رکھا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی دُلہن کا لباس ہوتا ہے۔ لاؤ میں تمہیں لال ساڑھی پہنا دُوں۔ ماں نے خاص طور پر اپنی بہو کے لئے خریدی تھی ــــ اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ آخر میں تمہارا دُولہا ہوں۔ تمہیں ساڑھی باندھنی آتی بھی تو نہیں۔ خیر آہستہ آہستہ سب کچھ سیکھ جاؤ گی بلکہ نہ ہی سیکھو تو اچھا ہے۔ تمہارے سب کام اپنے ہاتھ سے کرنے میں مجھے دِلی خوشی ہو گی۔"

ساڑھی باندھنے کے بعد تو چشم بد دُور کیا روپ آیا ہے تمہارے چاند سے مکھڑے پر۔ اچھا لاؤ میں تمہارے بال بھی سنوار دوں۔ چوٹی بناؤں یا جوڑا۔ تمہارے لئے میں نے سب کچھ سیکھ لیا ہے۔ اچھا آج جوڑا ہی بنا دیتا ہوں۔ ہندوستان ہوتا تو تمہیں دہلی شہر کی سب سے مہنگی ہیر ڈریسر کے پاس لے جاتا۔ انہیں جوڑا بنانے میں تو کمال حاصل ہے۔ اور دُلہن کے جوڑے کے لئے اُنکے چارجز بھی بہت ہائی ہوتے ہیں۔ کسی دِن تمہیں یہاں کی کسی ہیر ڈریسر کے پاس لے جاؤں گا ۔۔ بابی۔ تیرے خالق نے تیرے بال میری پسند کے بنائے ہیں۔ ریشم کے لچھے اور کالے سیاہ۔ ہمارے ہاں شاعر لوگ محبوبہ کے بالوں کو ساون کی کالی گھٹاؤں سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ سچ کالے بالوں کا ایک جُدا ہی حسن ہوتا ہے۔ ناگنوں کی طرح تمہارے جیسے رُخِ روشن پر لہراتے بہت خوبصورت لگتے ہیں۔

بابی۔ تمہارے میکے والے کہہ رہے تھے تم بہت خاموش طبیعت لڑکی ہو اور بڑی ہی صابر اور تابعدار کہہ رہے تھے ہیں تمہیں جیسے رکھونگا ویسے ہی رہو گی مگر میں وعدہ کرتا ہوں ڈارلنگ کہ میں تمہیں زندگی بھر آرام سے رکھونگا۔ تمہارے سب کام اپنے ہاتھوں سے کروں گا۔ تمہیں صوفے یا پلنگ سے قدم بھی نیچے نہیں دھرنے دونگا تاکہ تمہارے پاؤں میلے نہ ہو جائیں۔

یہ منگل سُوتر ہے۔ ہمارے پنجاب میں تو دُلہنیں ماتھے پر لال بندیا لگاتی ہیں مگر مہاراشٹر میں سہاگ کی نشانی کے طور پر اسے گلے میں ڈالے رکھتی ہیں۔ مجھے یہ رواج بہت پسند ہے ۔۔ بابی۔ تمہارا بہت سا کپڑا لتہ تو میں انڈیا سے لے آیا تھا۔ تمہارے پاپا نے پہلے ہی دِن تمہارے سب سائز مجھے بتا دئے تھے۔ اُسی سلسلے میں تمہارے آنے سے پہلے میں چند روز کے لئے انڈیا چلا گیا تھا۔

بابی۔ تم بڑی خاموشی اور دھیان سے یہ فلم دیکھنے میں گُم ہو۔ لگتا ہے تمہیں انگریزی فلمیں بہت پسند ہیں۔ چلو اندر کمرے میں لیٹے ہیں اور بیڈ کی پائنتی شیلف پر لگے ٹیلی ویژن پر دیکھتے ہیں۔ ویسے نارا فسٹ ہونا بابی۔ کئی انڈین فلمیں بھی بہت اچھی ہوتی ہیں۔ ہندوستان کی بمبیہ چھی تصویریں میں بمبیا فلموں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ جن میں چند بےتکے ناچ، دو معنی مکالمے، بے سر پیر کی کہانیاں، مار دھاڑ اور ننگی رانیں دکھا کر غریب عوام کو ٹھگ لیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کچھ اچھی آرٹ فلمیں بھی بنتی ہیں جن میں ہندوستان کا اصلی رُوپ صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ بنگال میں بننے والی فلموں کا تو جواب ہی نہیں ہوتا۔ کسی بھی بڑے سے بڑے ہیرو کو کہانی کی ضرورت کے مطابق دیہاتی بنا کر گاؤں کے گندے جوہڑ میں نہلوا دینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کمال ہے۔ ہمارے ہاں اسّی فی صد آبادی غریب ہے تو زندگی غریبی ہی کی تو عکاسی ہوگی۔

خیر بابی۔ تمہیں فکر کس بات کی ہے۔ تمہارا میاں تو لاکھوں مارک کماتا ہے۔ وہ تو میں صرف تمہیں اپنے ہندوستان کی ایک ذرا سی جھلک دکھا رہا تھا مگر ہاں میں یہ ضرور چاہوں گا کہ تم دِن بدن ہندوستانی رنگ میں رنگتی جاؤ۔ ہمارا ایک بہت پُرانا اور رِچ کلچر ہے۔ سچ مجھے اپنے کلچر پر بہت ناز ہے۔ سچ پوچھو تو میرا ملک اتنا غریب بھی نہیں۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے شہروں کی ایک ایک کوٹھی، ایک ایک بلڈنگ دیکھ لو تو دنگ رہ جاؤ۔ آج کا ہندوستان ہر لحاظ سے خود اپنے پاؤں پر کھڑا ہے۔ بس مر رہا ہے تو امیر کے حد سے زیادہ امیر ہونے اور غریب کے انتہائی غریب ہونے کی وجہ سے۔ چلو چھوڑو۔ میں یہ پہلے ہی دن کیا قصے لے بیٹھا ہوں۔ آج تو ہماری سہاگ رات ہے۔ آؤ تمہیں نائٹی پہنا دوں۔ شرم

کس بات کی۔ تمہارا ایساں ہوں۔ اچھا خیر میں اپنا منہ اُدھر کر لیتا ہوں ـــــ اور شفاف نائیٹی میں سے تمہارا جسم بتی کی لو کی طرح شیشے کی چمنی کو چیر کر روشنیاں پھیلاتا محسوس ہوتا ہے۔ بابی۔ تم ہو بھی تو بہت خوبصورت۔ سب لباس تم پریوں سجتے ہیں جیسے کسی مشہور ڈریس فرم نے تمہیں ماڈل گرل بنا کر خاص طور پر تمہارے لئے بنائے ہوں ـــ بابی تم شرماتی بہت ہو۔ اچھا ٹھہرو۔ میں رنگ برنگے شیشوں والے گلاس میں موم بتی جلا کر رکھ دیتا ہوں۔ کمرے میں بڑا خوبصورت رنگ برنگا اُجالا ہو جائے گا ـــ کیا کہا۔ نئی کے نو دن کے چونچلے ہیں نہیں بابی تم میرے لئے ہمیشہ نئی رہو گی اور تمہارے نو دن کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ نو مہینے، نو سال بلکہ نوے سال تک بھی نہیں۔ اور میں تمہیں بچہ پیدا کرنے کی مشین بھی نہیں بناؤں گا۔ تاکہ تمہارا فگر خراب نہ ہو جائے۔ تم مانو گی تو ہندوستان سے کوئی بچہ لا کر اڈاپٹ کر لیں گے۔ ذرا رونق ہو جائے گی۔

تم تو کچھ کھاتی بھی نہیں۔ میں بھی نہیں چاہتا کہ تم کھا کھا کر موٹی ہو جاؤ۔ مجھے موٹی اور بھدی عورتیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ ٹھیک ہے تم ڈائٹنگ کرو مگر خود کو بھوکا تو مت مارو۔ اچھا میں چلا۔ آفس کو دیر ہو رہی ہے۔ آج انڈیا سے بہت سا مال آ رہا ہے۔ اور ہاں یاد رکھنا۔ تمہیں کل میرے ساتھ مارکیٹ چلنا ہے۔ تھوڑی سی شاپنگ کرنی ہے۔

دوسرے دن وہ اُسے کار پر ساتھ لئے جیولر کی دکان پر پہنچ گیا۔ وہ پردوں والی کار میں ہی بیٹھی رہی اور وہ اکیلے ہی دُکان میں داخل ہو گیا۔

” بھائی صاحب۔ ایک سیٹ دکھانا۔ ہاں وہ ہیروں والا۔ انگوٹھی بھی ٹھیک رہے گی۔ نہیں آپ سب ہی باہر نکال دیں میں خود ہی ایک چن لوں گا ـــــ نہیں وہ نہیں آسکتیں۔ پردہ کرتی ہیں۔ آپ فکر نہ کیجئے۔ مجھے اُن کے سب سائیز معلوم ہیں۔ پازیبیں ؟ ہاں وہ تو بہت ضروری ہیں۔ چاندی کی۔ نئی دُلہن کے گورے گورے پاؤں میں چھنچھناتی پازیبیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ سارا گھر گنگناتا سا محسوس ہوتا ہے ـــــ جی ہاں نئی شادی ہوئی ہے۔

نہیں۔ فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ کتنے پیسے ہوئے ؟ سونا تو اصلی ہے نا ؟ کیا کہا ہر زیور پر انگلینڈ کی مُہر لگی ہے۔ چوبیس کیرٹ ہے تو ٹھیک ہے۔“

” بابی۔ تم بولتی کیوں نہیں۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ میں جو بول کر ساری کسریں پوری کر رہا ہوں۔ ویسے بھی مجھے تمہاری خاموشی بہت پسند ہے۔ ساری دُنیا میں لاکھوں کروڑوں عورتیں بول ہی تو رہی ہیں۔ ایک تم خاموش ہو تو کیا ہوا۔ اکثر عورتیں شادی کے ہفتہ بھر بعد بولنا شروع کر دیتی ہیں اور پھر تمام عمر بولتی ہی رہتی ہیں جیسے اپنی بولتی کا بٹن آن کرتے ہی اُس کے آف کرنے کا طریقہ بھول گئی ہوں۔

بابی تم بہت خاموش طبیعت لڑکی ہو۔ شرم کے مارے ہنس بھی نہیں سکتیں۔ صرف مُسکرا دیتی ہو۔ ہائے تمہاری شرمانے کی یہ ادا تو مجھے قتل ہی کئے دیتی ہے۔“

دن اچھے گذر رہے تھے۔ وہ اُسے کبھی کبھی باہر جھیل پر سیر کرانے بھی لے جاتا۔ اُسے کار سے نیچے نہ اُتارتا مبادا اُس کے پیر میلے ہو جائیں یا بے پردگی ہو۔ وہیں بیٹھے بیٹھے شیشوں کے پیچھے سے نظارے دکھاتا اور بولتا رہتا۔ وہ اپنی بابی کی دنیا میں اس قدر مگن رہنے لگا تھا کہ آفس سے واپس آنے پر چاہتا کہ بابی اُسے دروازے میں کھڑی اُس کا انتظار کرتی ملے۔ اس کا

طریقہ اُس نے یہ نکالا کہ جاتے وقت گیلری کے دروازے کے شیشے کے پیچھے اُسے کھڑی کر جاتا جیسے کپڑوں کی دکانوں میں شیشے کی شو ونڈوز میں خوبصورت لڑکیوں کی مورتیاں کھڑی رہتی ہیں۔ واپس آتا تو دروازے پر رُک کر باتیں کرنے لگتا۔

"اوہ ڈارلنگ بابی۔ تم دروازے پر ہی کھڑی میرا انتظار کر رہی ہو۔ سچ اپنے لئے تمہیں اتنی بے چینی سے انتظار کرتے دیکھ کر میرا دِل باغ باغ ہو جاتا ہے اور دن بھر بزنس کی جھک جھک بک بک سے تھکا ذہن پھولوں کی بگیا بن جاتا ہے۔ ہنستا، مُسکراتا اور گنگناتا ہوا۔

اب چلو۔ اندر بیٹھیں گے۔ مجھے کبھی اُردو رسالے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اچھے اچھے اَشعار میری بہت بڑی کمزوری تھے۔ دِل خوش ہو تو نظمیں، غزلیں سب اچھی لگتی ہیں۔ اَب تم سے کیا چھپانا، بیچ میں مجھ پر ایک ایسا دَور بھی آیا تھا کہ ذہن کی سلیٹ سب اچھی اچھی باتوں سے صاف ہو گئی تھی۔ اَب تم آ گئی ہو تو پھر سے اچھے اچھے اشعار یاد آنے لگے ہیں تمہاری موجودگی اِس طرح میری تحریک بنی رہی تو لگتا ہے میں بزنس مین سے شاعر بن جاؤں گا۔

آج تو موسم بہت سہانا ہے۔ تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے تھوڑی سی پی بھی ہے۔ ایک پیگ لیا ہے۔ باقی کسر تمہاری آنکھوں کے مدھ بھرے پیالوں نے پوری کر دی ہے۔ جی چاہتا ہے آج تھوڑا سا پاپ میوزک لگا کر تمہاری کمر پر ہاتھ رکھے سارے گھر میں ناچتا پھروں۔"

حسبِ معمول ایک دِن شام کو دفتر سے لوٹنے کے بعد وہ دروازے پر ہی بابی سے ہم کلام تھا کہ اُسے بابی کے ہونٹ ہلتے اور اُس کی باتوں کا جواب دیتے محسوس ہوئے۔ "تم آج پندرہ منٹ دیر سے آئے ہو۔ میں بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ اُسے خاموش طبیعت بابی پہلی بار بولتی اور وہ بھی شکایت کُناں بہت ہی عجیب لگی۔ اُس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ واقعی یہ بابی ہی تھی جو باقاعدہ اپنے لبوں کی جُنبش سے اُس سے شکایت کر رہی تھی۔ ساتھ ہی اچانک ایک خاص قِسم کی خوشبو کا بھبکا اُس کے نتھنوں میں گھسا تو وہ ایکدم مڑ گیا۔ پیچھے ایک لڑکی ہو بہو بابی کا رُوپ دھارے اُس سے ہم کلام تھی۔ دراصل شیشے کے پیچھے والا کالا پردہ اُوپر سے کھُل کر بابی کے آگے گِر گیا تھا جس نے بابی کو چھپا کر دروازے کے شیشے کو آئینہ بنا دیا تھا۔ اپنے پیچھے کھڑی لڑکی کے لب اُسے آئینے میں ہلتے اور بات کرتے محسوس ہوئے تھے۔

"میں سامنے اپنی کھڑکی سے کئی دِنوں سے بابی سے آپکی باتیں اور حرکات و سکنات نوٹ کر رہی تھی۔ میں آپکے سامنے والے گھر میں رہتی ہوں۔ میں نے سوچا۔ آپ کو زندہ بابی کی ضرورت . . . . . "

"اوہ . . . نو نو نو" کہتے سمیر نے دروازہ کھولا اور اندر جاتے ہی تڑاک سے دروازہ لڑکی کے مُنہ پر بند کر دیا۔

انگارہ

"چل اُٹھ سالی — ابھی کٹ جاتی تو . . . . تو کون ذمہ دار ہوتا۔"

بسنتی نے کوئلے بینتے ہوئے ہاتھ روک کر اُوپر دیکھا۔ پلیٹ فارم پر صرف جوان ہریانوی واچ مین اونچیل بسنت سنگھ کھڑا تھا۔ ابھی ۱۹ اَپ گئی تھی اور انجن کی جھاڑی ہوئی گرم گرم دھواں چھوڑتی راکھ صبح کی سردی میں اُسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔ "گاڑی تو جا چکی ہے۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی کیونکہ نیچے لائن میں بیٹھی بسنتی کو پلیٹ فارم پر کھڑا بڑی بڑی مونچھوں والا واچ مین اور بھی بڑا اور ڈراؤنا لگا۔ بسنتی کے چھوٹے سے فقرے کا مطلب تھا کہ کیا اُسے کاٹنے کو گاڑی واپس آجائے گی۔

"چُپ زبان لڑاتی ہے سالی۔" اُس نے ہاتھ کا بینت لہرایا۔ بسنتی نے بینت سے زیادہ اُس کے چہرے پر دیکھا۔ آجکل چہروں پر لکھے تمام سبق اُسے اَزبر ہونے لگے تھے۔ اس نے فوراً بسنت سنگھ کے چہرے کا سبق پڑھ لیا۔ یہ تو کوئی ہنسانے والا سبق تھا۔ وہ مُسکرا دی وہ بھی تو مونچھوں میں مُسکرا رہا تھا۔ اس کی زبان پر گندگی ضرور تھی مگر آنکھوں اور مونچھوں تلے کچھ اور لکھا ہوا تھا۔

"چل پہلے تھوڑے سے کوئلے کوارٹر پر ڈال دے۔ آج بہت سردی ہے۔" وہ بولا۔

پہلے بھی کوئلوں کی تھوڑی بہت رشوت ریلوے سٹاف کے لوگ کبھی کبھی اُس سے مار لیا کرتے تھے۔ اُس نے جھولی کے مٹھی بھر کوئلوں کی طرف دیکھا اور اُٹھ کر جنگلے کے ساتھ ہی واچ مین کے الگ اور اکلوتے کوارٹر پر کوئلے انگیٹھی میں ڈال کر مُڑنے ہی لگی تھی کہ بسنت سنگھ نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس سے پہلے کسی نے اُس کے ساتھ ایسی زیادتی نہیں کی تھی۔ وہ کسمسا کر پیچھے ہٹی مگر بسنت سنگھ کے مضبوط ہاتھوں نے بھینچ کر اُسے اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ "سالی تو تو خود جلتا ہوا کوئلہ ہے دہکتا ہوا انگارہ۔"

بسنت سنگھ کی چھاتی کا پرندہ اُس کے کانوں میں کوئی میٹھا راگ الاپنے لگا۔ اُس کے دماغ میں اپنی نئی شادی شُدہ سہیلی گنتی کے الفاظ گونجنے لگے۔ جب مرد چھاتی سے لگاتا ہے نا تو بڑا مزا آتا ہے پھر کیا ہوتا ہے؟ اُس نے پوچھا تھا۔

موٗرنگ پوری میں گھنٹے بجنے لگتے ہیں۔ کُنتی نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔ پھر؟ پھر..... پھر یہ ہو جاتا ہے۔ کُنتی نے اُس کا ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھ دیا تھا جہاں اُسکے اندر بسنتی کو کوئی پنجرے میں بند پرندہ پھڑپھڑاتا محسوس ہوا تھا۔ ہائے میں مر جاؤں۔ بسنتی کے منہ سے ایسے ہی نکل گیا تھا جیسے پرندہ خود اُسکے پیٹ میں گھس گیا ہو اور اُڑ جانے کو بے قرار پنجرے کی تیلیوں سے ٹکرا رہا ہو۔ کبھی تو ایک ہی بار ہو جاتا ہے اور کبھی کئی کئی بار میں بھی کچھ نہیں ہوتا۔ مرد مرد کی بات ہے۔ وہ کیسے؟ بسنتی نے پوچھا تھا۔ کئی بڈھے کھوسٹ ہوتے ہیں اور کئی جوان ہو کر بھی بڈھے ہوتے ہیں خالی برتن۔ ٹھن ٹھن گوپال۔ کُنتی نے کہا تھا۔

بسنت سنگھ کی مونچھیں اُس کے چہرے کے سارے علاقے کی جریب کشی کر رہی تھیں۔ جب اُسکی مونچھوں کے تنے ہوئے دو چار بال بسنتی کے نتھنوں میں گھسے تو اُسے چھینک آ گئی۔ یہ وہ چھینک تھی جو بیماری نہیں، طبیعت صاف ہو جانے اور آرام پہنچانے کی نشانی کے طور پر آتی ہے۔ بالوں کی یہ سرسراہٹ اُسے گدگدا کر ہنساتی محسوس ہو رہی تھی اور کچھ اور بھی تو ہو رہا تھا جیسے جیسے... جیسے کسی نے انگلی پر بہت سا شہد لگا کر انگلی اُس کے منہ میں رکھ دی ہو۔ مگر یہ کیا۔ شہد کی مٹھاس میں ہلکا ہلکا درد بھی شامل تھا جو اتنا میٹھا تھا کہ انگ انگ میں پوری بوتل کا نشہ سا انڈیلتا محسوس ہوتا تھا۔ اسکی آنکھیں مند کر اُسے کسی اور خوابوں بھرے جزیرے میں لے گئی تھیں۔ اُسے لگا تھا کُنتی سچ کہتی تھی۔

بسنت سنگھ سے ملاقات کے بعد وہ کئی دن تک اپنے پیٹ پر ہاتھ لگا لگا کر دیکھتی رہی تھی مگر اُس کا پیٹ بدستور طبلے کی طرح کسا ہوا تھا۔ جوانی کی تنیاں دن بدن اس کے پیٹ کو اور زیادہ کستی جا رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ پیٹ کو ٹٹولتے ہوئے ساری نچلی پیٹھ اور کمر کا چکر لگا آتا اور اُسے وہ گھیرا پہلے سے بھی اور چھوٹا اور تنگ محسوس ہونے لگتا اور وہ سوچنے لگتی۔ کہیں بسنت سنگھ خالی برتن تو نہیں۔

پہلے پہل بسنتی کو اپنے جسم میں آتی تبدیلیوں کا خود کوئی پتہ نہیں لگا تھا۔ یہ تو محلے کے چھوکروں اور سٹیشن کے لوگوں کی نظروں اور ننگے فقروں نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ اب کچھ اور چیز بن گئی ہے۔ یہ اور چیز اُسے اپنی مستی بھری چال، کاموں میں ہاتھوں کی بے انتہا سُرعت، جھگی کے سرکنڈوں میں ٹنگے ٹوٹے ہوئے شیشے میں آنکھوں کا خمار اور سانولے سلونے رنگ میں بھی ایک خاص قسم کی چمک میں نظر آ گئی تھی۔ جانے کیا بات تھی کہ ٹی سٹال کا بوڑھا پنڈت ہر گوبند جو پانچ سال پہلے بڑی منت سماجت کے بعد اپنی جھوٹی چائے بھی اُس کے مٹی کے کُجے میں فٹ بھر اوپر ہاتھ کر کے ڈالا کرتا تھا۔ اب تازہ چائے اپنے ہاتھ سے بنا کر ایک خوبصورت سے مگ میں ڈال کر دینے لگا تھا مگر یہ سب وہ تب کرتا تھا جب اُس کا نوکر چھوکرا سٹال پر نہیں ہوتا تھا۔ چھوکرے اور گاہکوں کی موجودگی میں تو اس کا رویہ وہی تھا با نسا ہو جاتا تھا مگر اکیلے میں مگ پکڑاتے ہوئے وہ اپنی یخ بستہ انگلیاں اُسکی انگلیوں پر رکھ دیتا تو بسنتی کو برف کی ایک ڈلی ہاتھوں کی راہ ریڑھ کی ہڈی میں اُترتی جسم کے کسی انجانے حصے میں غائب ہوتی محسوس ہوتی اور وہ تمام جسم سے تھرتھرا جاتی۔ وہ جلدی جلدی چائے سُڑکتی اور لائنوں میں کوئلہ چُننے اُتر جاتی مگر وہاں بھی پنڈت کی آنکھوں کے تیر اُسے اپنی پیٹھ اور گدی پر چبھتے محسوس ہوتے رہتے نتیجتاً وہ کئی کئی دن سردی سے ٹھٹھرنے

کے باوجود سٹال کے نزدیک نہ پھٹکتی۔

بسنت سنگھ نے پچھلے دو ماہ سے اس کے کوارٹر پر کوئلہ نہیں ڈلوایا تھا۔ ایک چاہت بسنتی کے دل میں موجود کہ کاش بسنت سنگھ ایک بار پھر کوئلہ ڈلوانے اُسے کوارٹر پر لے جائے اور ایک ڈر یہ کہ کہیں پیٹ کا پنچھو آباد نہ ہو جائے۔ کتنی تو پندرہ دن کا چھورا گود میں اُٹھائے اپنے ماں باپ کو دکھانے پڑوس کی جھگی میں آگئی تھی۔ وہ کتنے فخر سے سب کے سامنے کہتی تھی۔ چھورا بالکل اپنے باپو پر گیا ہے۔ اگر اُسے کچھ ہو گیا تو وہ کیسے سب کے سامنے ایسا کہہ سکے گی کیونکہ بسنتی کو چند ہفتوں نے ہی بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔

کچھ دن سے بسنتی کے ہاتھ تو کوئلہ چنتے رہتے مگر آنکھیں بسنت سنگھ کو تلاش کرتی رہتیں کیونکہ پیٹ کے طبلے کی ڈھیلی پڑتی تینیوں نے اُسے شک میں ڈال دیا تھا۔ بسنت سنگھ ایک آواز پیدا کرتا، بنایبنت پلیٹ فارم کے پتھریلے فرش پر مار مار کر چلتا تھا۔ کاش اُس کے بنیت کی آواز ہی اُس کے کانوں میں بج اُٹھے۔ دراصل ان دنوں ایک بڈھا اس کی ماں کے پاس آنے لگا تھا۔ وہ ماں اور اُس کے لئے کچھ کپڑے لتے بھی لاتا تھا اور پھر بہت دیر تک اُن میں کھسر پھسر ہوتی رہتی تھی۔ ساتھ بڈھے کی آنکھیں بھی بسنتی کی ہر حرکت کا طواف کرتی رہتی تھیں ایک بار اُس نے اُن کی باتیں سُن لیں جن میں اُس کا بھائی بھی شامل تھا۔ اس کے خریدنے پر اُن میں کچھ لین دین کی بات ہو رہی تھی۔ کاش آج اس کا باپ زندہ ہوتا تو وہ ضرور اُسے اس نرک میں گرنے سے بچا لیتا۔ اُس کا بھائی تو ہونے نہ ہونے کے برابر تھا کیونکہ وہ اسکی ماں کے پہلے خاوند کی اولاد تھا اس لئے باپو نے کبھی اُس سے سچی محبت نہیں کی تھی کبھی کبھی اُن میں جھڑپ بھی ہو جاتی تھی۔ اسی وجہ سے ہوش سنبھالتے ہی وہ گھر سے بھاگ گیا تھا مگر باپو کے مرنے کے بعد اپنی سوتیلی بہن کے دام کھرے کرنے کے لئے اپنے ایک بڈھے دوست کے ساتھ لوٹ آیا تھا اور پیسے کے لالچ میں ماں بھی اُس کی ساتھی بن گئی تھی۔ ایک دن بسنتی نے صاف صاف ماں سے کہہ دیا۔ "ماں تو جو کچھ سوچے بیٹھی ہے وہ نہیں ہونے کا۔"

"کیوں نہیں ہونے کا، کلمکھنی۔ میں کئی دن سے تیرا بڑھتا ہوا پیٹ دیکھ رہی ہوں۔ بڈھا تو پھر تجھے اور تیری کالک کو سنبھال لے گا میں نے اُسے سب کچھ بتا دیا ہے مگر دوسرا کوئی تیرے مُنہ پر تھوکے گا بھی نہیں۔" پھر وہ نرم پڑتے ہوئے بولی۔ "دیکھ میں تیری ماں ہوں، تیرے بھلے کی کہتی ہوں۔" پھر آواز کو اور دھیما کرتے ہوئے وہ بولی۔ "بہت پیسہ ہے بڈھے کے پاس۔ راج کرے گی۔ ہم لوگوں کے اور سلسلے بھی تو چلتے رہتے ہیں۔ تو تو ابھی جوان جہان ہے۔ باہر بھی تجھے کیا کمی۔ بڈھا کون سی تیری ہر وقت رکھوالی کر سکے گا۔"

کوئلہ چنتے ہوئے بسنتی نے دیکھا جنگلے کے اُس پار بسنت سنگھ کے کوارٹر کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ ۱۹۔ آپ ابھی ابھی گئی تھی۔ ڈرائیور نے آج بہت سے ادھ جلے کوئلے نیچے جھاڑ دیئے تھے اور بسنتی کی جھولی پوری طرح بھر گئی تھی۔ وہ صبح کے ہلکے ہلکے اندھیرے میں کوارٹر کی طرف بڑھ گئی۔ اندر سامنے چارپائی پر بسنت سنگھ پڑا تھا۔ اُس نے کوئلے انگیٹھی میں اُلٹے تو بسنت سنگھ چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ "کون ہے؟" اُس نے آنکھیں ملتے ہوئے

سپاہیانہ گرج کے ساتھ پوچھا۔

بسنتی اُس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ "اب اپنی بسنتی کو بھی نہیں پہچانتا ہے۔"

وہ مونچھوں میں مسکرایا یا شاید بسنتی کو ایسے لگا۔ وہ اُس کی چارپائی کی پٹی کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ آج اُس کی اپنی جوانی طوفان زدہ دریا بنی ہوئی تھی اور دل کا وہ خوف بھی وقتی طور پر دور کہیں کسی گہری کھائی میں دفن ہو گیا تھا۔ آج تو جو ہونا ہے ہو جائے، وہ سوچ کر آئی تھی۔ عورت جب آگے بڑھتی ہے تو کئی کھائیاں بے جھجک پھلانگ جاتی ہے۔ وہ اُس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئی اور اُس کا ہاتھ اپنی چھاتی پر رکھتے ہوئے بولی۔ "دیکھ تو کیسا دھک دھک کر رہا ہے میرا دل۔"

"کہاں؟" دل تلاش کرنے کو بسنت سنگھ نے اُس کی ساری چھاتیاں ٹٹول ڈالیں۔ اُس کے ہاتھوں تلے وہ چولھے پر چڑھی گرم گرم اُبلتے ہوئے پانی کی کیتلی بن گئی۔ کب وہ خوابوں کے رنگین جزیرے میں پہنچی۔ کب شہد اُس کے انگ انگ میں ٹپکا، اُسے کچھ بھی پتہ نہ چلا۔ اُس کا دماغ تو اپنا سب کچھ بسنت سنگھ کے حوالے کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ اور ہی سوچوں میں گم تھا۔ جب بسنت سنگھ کا جسم ڈھیلا پڑ کر چارپائی کی اور زیادہ گہرائیوں میں دھنس گیا تو بسنتی انگیٹھی پر چائے کا پانی رکھنے چلی گئی مگر پانچ منٹ بعد ہی بسنت سنگھ اُس کے سر پر آ کھڑا ہوا۔

بولا۔ "رہنے دے۔ اب تو جا۔"

"ماں مجھے ایک بڈھے کے ہاتھ سونپ رہی ہے۔" اُس نے بسنت سنگھ کو اتنا ہی بتانا کافی سمجھا۔ اُس کے خیال میں جیسے یہ اطلاع بسنت سنگھ کو جھنجھوڑ کر رکھ دے گی مگر بسنت سنگھ نے کمال لاپرواہی سے اُسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"اب تو جا۔"

"نہیں اب تو میں تیری بسنتی بن کر یہیں تیرے پاس رہوں گی۔" وہ بانہہ چھڑا کر انگیٹھی کے پاس بیٹھی رہی۔

"تیرے پاس رہوں گی۔" بسنت سنگھ نے اُس کا منہ چڑایا۔ "سالی دو ملاقاتوں میں ہی گھر کی مالکن بن بیٹھی ہے۔"

"بسنتا۔" اُس نے اُس کے نام کو مختصر کر کے اپنا سارا سچا اور کھرا پیار اس میں انڈیلتے اور کھڑی ہوتے ہوئے اُس کا ہاتھ اپنے پیٹ پر رکھ کر کہا۔ "دیکھ میرے پیٹ میں تیرا بچہ پل رہا ہے۔ تیرا اپنا خون۔"

"بکتی ہے سالی۔ کسی دوسرے کا پاپ میرے سر تھوپنا چاہتی ہے۔" اُس نے اپنے لہجے میں بے انتہا نفرت بھرتے ہوئے اُس کے پیٹ کے طبلے پر نفرت بھری تھپ ماری۔

درد کی تڑپ سے تلملاتی، چکراتے سر کے ساتھ سہارے کے لئے اُس کے ہاتھوں میں بسنت سنگھ کا چہرہ آ گیا اور اُس کے ہاتھوں کی کونپلوں بھری ساری کا لک بسنت سنگھ کے چہرے پر پُت گئی۔ پیٹ پر ہاتھ

سے آہستہ آہستہ وہ کوارٹر سے باہر نکل گئی۔ اسی شام اُس کے اقرار پر اُس کی ماں نے بڈھے کے ساتھ اُس کے ہاتھ پیلے کردیئے۔

سہاگ رات کو کب وہ بڈھے کے پہلو سے اُٹھ کر باہر گئی۔ اور کب واپس آکر دوبارہ اُس کے پاس آلیٹی یہ تو بڈھے کو بھی پتہ نہیں لگا مگر آدھی رات کو شعلوں میں گھرا دھوں دھوں کرتا بسنت سنگھ کا کوارٹر سب نے دیکھا۔ ●●●

ڈھائی اکھر

جرمنی میں سردار ٹہل سنگھ اپنی سِکھی کے تمام لکّے اُتار کر بھی سردار رہ گیا تھا۔ وہ دراصل ڈھائی اکھر جرمن زبان کے سیکھ کر ہائم نمبر چھ کے چیف کا چہیتا بن گیا تھا اور اُس کی طرف سے مقرر کردہ اپنے کمرے والوں کا سردار۔ ہمارے کمرے کے پانچوں لمبے دھڑنگے پنجابی، جو اپنے باپوں کی زمینیں آدھے پونے بیچ کر جرمنی پہنچے تھے جرمن تو کیا انگریزی کے بھی دو لفظ تک ٹھیک طرح سے نہیں بول سکتے تھے۔ جرمن شیف کو اُن سے جب بیڈ کا ہفتہ واری کرایہ وصول کرنا ہوتا، کوئی بات سمجھانی ہوتی، ان کی نالائقیوں، غلطیوں اور گندگیوں پر تنبیہ کرنی ہوتی تو وہ اُنہیں جرمن زبان میں خوب جلی کٹی سناتا مگر جب اس کی بد زبانی اور غصے پر وہ اور زیادہ محظوظ ہونے لگتے تو وہ ٹہل سنگھ کو مدد پر بُلا لیتا اور ٹہل سنگھ اُس کی کچھ بھی بات نہ سمجھ کر اپنے ڈھائی جرمن اکھروں کے سہارے سب کچھ سمجھ کر سر ہلاتا اپنے پنجابی بھائیوں کی طرف بڑھ آتا اور انہیں سب کچھ سمجھا دیتا۔ ٹہل سنگھ بھی اُن پانچوں پر غصے ہی ہوتا، گرجتا اور برستا بھی مگر ساتھ ہی اس کی گھن گرج میں ٹھنڈی میٹھی پھوار کی لہریں بھی چھپی نظر آتی رہتیں اور وہ ٹیڑھے میڑھے پنجابی سیدھی راہ پر آجاتے اور جرمن سیٹھ کی تمام شکایتیں وقتی طور پر دُور ہو جاتیں۔

کمرے کے سات ساتھیوں میں ایک میں ہی پڑھا لکھا تھا اور کسی نہ کسی طرح جرمن سیٹھ سے گذارے موافق ٹوٹی پھوٹی انگریزی ملی جرمن سے کام چلا لیتا تھا۔ اس لئے ٹہل سنگھ مجھ سے تھوڑا دبتا اور تمیز سے پیش آتا تھا۔

مجھے جرمنی آئے ایک مہینہ ہو چکا تھا۔ مگر اُن سب میں ایک میں ہی بے روزگار تھا اس لئے رات رات بھر بیٹھا سوچا کرتا کہ مجھے کس پھوڑے کاٹا تھا کہ اچھی بھلی نوکری چھوڑ کر جرمنی بھاگ آیا۔ رات کو دو یا تین بجے کے بعد جب میری آنکھ لگتی تو صبح دس بجے سے پہلے نہ کھلتی، ہاں بیچ میں کوئی چار یا پانچ بجے کے درمیان کچھ شبد میرے کانوں میں ضرور بج اُٹھتے مگر میں اُنہیں اپنے ہی خوابوں کی بڑبڑاہٹ سمجھ کر سر سے چادر تان کر سو جاتا۔ کبھی کبھی سُر میں گائے جاتے یہ الفاظ کچھ صاف بھی سنائی دے جاتے۔ "ڈھائی اکھر پیار کے ....."

میں دس بجے کے قریب اُٹھتا تو اکیلا ٹہل سنگھ رضائی منہ پر ڈالے خراٹے لے رہا ہوتا۔ اور باقی سب اپنے اپنے

کام پر جا چکے ہوتے۔ اُس کی چارپائی کے پاس ہی اس کی چوبیس بیئر کی بوتلوں کا کریٹ پڑا ہوتا اور سائیڈ ٹیبل پر ایک کھلی بوتل۔ کبھی کبھی رضائی میں سے اس کا ہاتھ باہر آتا، بیئر کی کھلی بوتل رضائی کے اندر لے جاتا اور پھر وہی ہاتھ میز ٹٹولتا، آدھی خالی بوتل واپس میز پر دھر دیتا۔ یہ سلسلہ کئی بار دُہرایا جاتا حتیٰ کہ بوتل خالی ہو جاتی تو وہ ننگ دھڑنگ رضائی سے باہر نکلتا، آدھا سویا، آدھا جاگا کریٹ تک پہنچتا، اور پھر سے بوتل کھولتا اور اپنے پاس میز پر رکھ دیتا۔

ٹہل سنگھ مجھ سے انگریزی سیکھنے کے لئے ہمیشہ انگریزی میں بات کرتا تھا مگر ہزار کوششوں کے بعد بھی اُس کی انگریزی اُس کے اپنے ڈھائی لفظوں تک ہی محدود رہتی۔ "نندہ صاحب۔ آئی ٹیکسی بگ بگ صاحب نئی دہلی، فادر ٹیکسی دہلی، مینی منی، بگ ہوم"۔

میں سمجھ جاتا کہ وہ اپنی اسی ٹوٹی پھوٹی انگریزی سے یورپ سے آئے سیاحوں کو نئی دہلی کی سیر کراتا ہوگا، باپ بھی اُس کا دہلی کا ٹیکسی ڈرائیور ہوگا، اچھا پیسہ اور اچھا گھر ہوگا پھر اُسے جانے کیا سُوجھی کہ سب کچھ چھوڑ کر جرمنی بھاگ آیا، اِس کا جواب خود میری اپنی صورت میں میرے پاس تھا مگر پھر بھی میں اُس سے پوچھ ہی بیٹھتا۔ "ٹہل سینہا۔ وائی یو کیم ٹو جرمنی ؟"

"نندہ صاحب۔ نو جرمنی۔ آئی اِنگلینڈ ٹیکسی، فادر دِلی ٹیکسی، مینی منی، بِگ ہوم"۔

"تو کیا تم انگلینڈ جا کر ٹیکسی چلانا اور امیر ہونا چاہتے ہو؟"

وہ پہلے اپنی چھاتی پر اُنگلی رکھتا پھر میری چھاتی پر اُنگلی رکھ کر کہتا۔ "یُو تو ہندی می، اِنگلش اونلی"

میں سمجھ جاتا کہ انگریزی سیکھنے کے شوق میں وہ میرے ساتھ صرف انگریزی میں ہی بات کرنا چاہتا ہے۔ میں انگریزی بولتا، وہ اگر کچھ بھی نہ سمجھ پاتا تو بھی سر ہلاتا یس یس یوں کئے جاتا جیسے بہت بڑا انگریزی داں ہو اور میری سب باتیں سمجھ رہا ہو۔ کبھی کبھی تو میری انگریزی ٹاک سے ایک آدھ لفظ پکڑ کر وہ ساری بات سمجھ اور سمجھا کر مجھے حیران کر دیتا۔ شاید نئی دہلی میں یورپی سیاحوں کے ساتھ وہ ایسے ہی گذارہ کر لیتا ہوگا۔

بے روزگاری نے مجھے تھوڑا چڑچڑا بنا دیا تھا اور ٹہل سنگھ کو اس کا علم تھا مگر وہ میری کیا مدد کر سکتا تھا، وہ تو خود بے روزگار تھا۔ ایک رات صبح چار بجے تک مجھے نیند نہیں آئی اور ساڑھے چار بجے کے قریب گائے جانے کچھ الفاظ صاف میری سماعت سے آٹکرائے۔

پڑھ پڑھ کے سب جگ مویا تے پنڈت بھیا نہ کوئے
ڈھائی آکھر پیار کے پڑھے سو پنڈت ہوئے

میں نے چادر مُنہ سے ہٹا کر دیکھا۔ یہ ٹہل سنگھ تھا جو مُنہ ہاتھ دھو کر، کپڑے پہنتا ہوا مُنہ ہی مُنہ میں کچھ مقدس شلوکوں کا پاٹھ کرتا کہیں جانے کو تیار ہو رہا تھا۔ نیند تو مجھ سے رُوٹھ ہی چکی تھی۔ میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔۔۔ "ٹہل سنگھ۔ کہیں جا رہے ہو؟"

اُسے میرا ہندی میں پُوچھنا بُرا لگا مگر مجھے راہِ راست پر لانے کے لئے وہ انگریزی میں بولا ۔ "آئی ورک"
"وئیر؟ کین یُو گیٹ می اے جاب؟ ؟" (کہاں؟ کیا تم مجھے کام دِلوا سکتے ہو؟ ؟")
وطن سے لائے دِن بدن جیبوں سے نکلتے ڈالر اور بے روزگاری نے مجھے ٹہل سنگھ کے آگے جُھکنے اور نوکری مانگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اُس نے وئیر اور جاب ہی کے دو الفاظ سے اندازہ لگا لیا کہ میں اُس سے کوئی نوکری دلوانے کی درخواست کر رہا تھا۔ وہ بولا "یُو بگ صاحب۔ آئی سبزی منڈی"
بے روزگاری مجھے اُوپر سے نیچے لے آئی تھی۔ میں نے اُسے سمجھایا کہ کام کام ہوتا ہے۔ کام چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ مجھے اپنے ساتھ سبزی منڈی لے گیا۔ وہاں وہ ٹرکوں سے آلوؤں کے بیس بیس کلو کے بورے اُتارنے اور اندر منڈی کی دُکانوں پر پہنچانے کا کام کرتا تھا۔ اس نے ٹرک ڈرائیور سے اپنے ڈھائی جرمن لفظوں کے ذریعے میری سفارش کی۔ ڈرائیور نے مجھے اُوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اُس کے میرے کمزور جُثّے کو دیکھتے ہوئے ایک بار تو مجھے لگا جیسے میں اُس کے کام کا آدمی نہیں اور وہ فوراً انکار کر دے گا مگر نجانے اُسے میرے مریل جسم یا بسُورتی صورت پر ترس آ گیا یا ٹہل سنگھ کے ڈھائی لفظوں نے کوئی کمال کر دکھایا کہ اُس نے مجھے بورے اُٹھانے پر رکھ لیا۔
دس ہی دن کے بعد میرے جسم کے اندر کی سر سے پاؤں تک لٹکی ہڈیوں کی زنجیر کہیں بیچ سے تڑکی ہوئی محسوس ہونے لگی اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ کام کام نہیں ہوتا چھوٹا یا بڑا ہوتا ہے اور ہر کام ہر ایک کے بس کا نہیں ہوتا۔ گیارہویں دن جب ٹہل سنگھ نے صبح چار بجے مجھے آواز دی تو میں سُنی اَن سُنی کرتا بستر میں مست پڑا رہا۔ کام صبح پانچ سے نو بجے تک ہوتا تھا۔ اُس روز جب وہ واپس آیا تو بولا۔ "نندہ صاحب یُو اوکے؟" شاید وہ مجھے بیمار سمجھ کر چلا گیا تھا۔
"ٹہل سنگھ ۔ یہ کام میرے بس کا نہیں"
"آئی ٹیل ۔ نو گڈ ورک" (میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ کام تمہارے لائق نہیں۔)
فری انٹری ہونے کی وجہ سے دراصل جرمنی اُن دِنوں برصغیر پاک و ہند سے آنے والے سب پڑھے اور اَن پڑھے ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کا ٹرانزٹ سٹیشن تھا۔ آئے ٹک آرام کیا۔ کما کر چار مارک جیب میں ڈالے اور آگے کسی انگریزی بولنے والے ملک کو سدھارے اس لئے بزعم خود انگریزی ہر ہندوستانی اور پاکستانی جانتا تھا اور سمجھتا تھا کہ امریکہ، کینیڈا یا انگلینڈ کے بادشاہ یا فرمانروا ہاتھوں میں ہار لئے اُن کے منتظر کھڑے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان ممالک کے سخت قوانین اور تیز نظر رکھنے والے افسروں سے بچ بچا کر چند ہی لوگ پار اُتر پاتے تھے۔ ہر کوئی بنا کسی ساتھی کو بتائے اندر ہی اندر اور باہر ہی باہر کوشاں رہتا اور جب ایک دن وہ بستر باندھتا یا شام کو اُس کا بیڈ خالی ملتا تو ساتھیوں کو پتہ چلتا کہ ایک پنچھی اور اُڑ گیا مگر ٹہل سنگھ کو اپنے اُوپر پورا اعتماد تھا کہ وہ انگلینڈ بڑی آسانی سے سیٹ ہو جائے گا۔ اسلئے وہ اس بات کو چُھپاتا نہیں تھا۔
ایک دن شام کے وقت وہ گُڈ ونگی کے سٹال پر کھڑا بیئر پیتا چند دوستوں سے گپیں ہانک رہا تھا۔ میں وہاں

ے نکلا تو اُس کے ست سری اکال، کا جواب دینے کو بھر کے لئے رُک گیا۔ وہ اُن سے کہہ رہا تھا۔ "میں جب پیدا ہوا تو میرے باپ نے دادا کو بتایا، مُنڈا ہوا ہے ٹہلنے کے شوقین دادا گھر کے باغیچے میں ٹہل رہے تھے۔ بولے دھن دھن واہے گورُو، تو اپنا ٹہل سنگھ آگیا۔ بس تب سے میرا نام ٹہل سنگھ پڑ گیا۔ تم دیکھنا، میں ٹہلتے ٹہلتے ایک دن لندن جا براجونگا۔"

دو تین لڑکے تو کسی نہ کسی طرح کینیڈا اور امریکہ کی طرف نکل گئے۔ میں نے بھی انگلینڈ کی طرف ایک ٹرائی ماری مگر پہلے ہی ہلّے میں اپنے تمام ضخیم انگریزی لفظوں کے ذخیرے کے باوجود کسٹم پر ہی مار کھا گیا اور واپس جرمنی لوٹ آیا۔ پھر نجانے کیا ہوا اور کیسے ہوا کہ ٹہل سنگھ اپنے ڈھائی اکھروں کے سہارے انگلینڈ پہنچ گیا۔ دو ہفتے بعد لندن سے اُس کا انگریزی میں خط مِلا۔

"میں انگلینڈ پہنچ گیا ہوں۔ ابھی تو خود ڈانواں ڈول ہوں۔ آپ کی کیا مدد کروں میں اپنا اصلی نام تک نہیں لکھ سکتا۔ تمہارا واک سنگھ"، میں نے اوپر اس کے خط کا ترجمہ ذرا تفصیل سے کر دیا ہے ورنہ یہ خط تو ڈھائی جمع ڈھائی یا پانچ لفظوں پر مشتمل تھا۔

اور میں اِدھر ناروے پہنچ گیا کہ تب صرف اِدھر ہی دروازے کھلے ہوئے تھے اور پشتم پشتم اِدھر نئی اور انجانی زبان کو گالیاں دیتا اور اس کا ایک ایک لفظ چُنتا ہوا کچھ عرصہ بعد ایک دفتر میں ملازم ہو گیا اور وہ اُدھر اپنے ڈھائی اکھروں کے سہارے ایک بہت بڑے سٹور کا مالک بن گیا۔ یہ مجھے تب پتہ چلا جب وہ ایک دن اوسلو کے بڑے بازار کارل یوہان گاتے پر سیر کرتا مل گیا۔ ارے ٹہل . . . . اور نندہ صاحب ان لفظوں کے ساتھ دوڑ کر ہم آگے بڑھے اور گلے مِل گئے۔

"کہاں ٹھہرے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"گرینڈ ہوٹل" اس نے بتایا اور میں چونک اُٹھا کہ یہ اوسلو کا سب سے پُرانا، بڑا اور مہنگا ہوٹل تھا۔

"میں یہیں اوسلو میں رہتا ہوں۔ ہوٹل چھوڑو اور میرے ساتھ چلو" میں نے دوستانہ پیش کش کی۔

"نہیں بزنس کے سلسلے میں آیا ہوں، میم بھی ساتھ ہے۔ اُدھر مرسیڈیز میں بیٹھی ہے۔ بڑے ہوٹل سے ذرا بزنس میں رعب پڑتا ہے۔ مِلونگا ضرور۔ پتہ کیا ہے تمہارا؟"

میں نے کاغذ پر پتہ لکھ دیا۔ اُس نے اپنے لندن کا خوبصورت سا ایڈریس کارڈ پکڑا دیا۔ "آپکو خط لکھا تھا۔ جواب نہیں آیا تو میں سمجھ گیا کہ آپ جرمنی سے نکل گئے ہو نگے" وہ بولا۔

وہ جلدی میں تھا۔ مجھے بھی دفتر پہنچنا تھا۔ جہاں کل ہی تیسری بار پندرہ سال بعد بھی نارویجین زبان اچھی طرح نہ جاننے کی وجہ سے میں اپنی اگلی ترقی کا کیس ہار چکا تھا۔ اور آج اس سلسلے میں چیف سے میری میٹنگ تھی۔ میں نے دِل ہی دِل میں نارویجین زبان کو ایک موٹی سی گالی دی۔ وہ مجھے سوچوں میں ڈوبا دیکھ کر بولا۔ "یو سِم۔ آئی اینڈ میم کم۔"

فسانے پیار کے لکھوائے
تو کوئی ہم سے لکھوائے

"مجھ سادؔ کے ساتھ پہلی بار نا سادگی یہ ہوئی کہ ......" وہ اُردو اِسی طرح بولتے ہیں۔ کئی بار تو خود ہی کہتے ہیں۔ "میں اُردو کی ایسی تیسی پھیرتا ہوں۔ کہتے ہیں جب میری ایسی ویسی اُردو بھی بجتی ہے تو مجھے کالے گتے نے کاٹا ہے کہ میں اپنا سین کاف درست کرتا پھروں۔" اپنے دیش میں اس کے چند اُردو دان دوستوں نے اُنہیں اُردو کے نام پر چند ایوارڈ بھی دینے کے وعدے کر رکھے ہیں مگر اُن کی شرط یہ ہے کہ وہ پہلے اُنہیں یہاں نارویے بلوائیں۔ اِسی چکر میں وہ ہر محفل میں ہر رنگ سے گھس بیٹھ کرتے اور خود کو عظیم فن کار تسلیم کروانے کی کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ اپنے دیش کے اُن کے سب ساتھی فلم محل سے مُغلِ اعظم تک اُردو پڑھے ہوئے ہیں۔ وہاں اُن کے جاری کردہ ایوارڈ اور ٹرافی کا نام ہم کلم ساتھی ہے جو وہ لوگ، عورتوں کے کمیٹی ڈالنے کی طرح، آپس میں بانٹتے رہتے ہیں۔ ایک بار کسی پڑھے لکھے نے اعتراض کیا تھا کہ یہ لفظ کلم نہیں قلم ہونا چاہئے تو اُنکے صدرِ محفل کا جواب تھا، یہ کلم دراصل قلم اور کلام کا بچولا لفظ ہے یہ دراصل اُردو کے نام پر فائدہ اُٹھانے والے آدھ کچری ہندی جاننے والوں کی ہم کلمی یا ہم کلامی کی محفل ہے جو اَب آہستہ آہستہ اپنی نظموں اور گجلوں سے اُردو مقبولیت کے قلعوں پر یلغار کرنے لگی ہے۔

شادؔ صاحب کہتے ہیں۔ پنجابی بھنگڑہ، بانسری، طبلہ، مُدیری، کہانی لیکھن، نظم، گجل، پینٹنگ، لیکچر، گائیکی، سٹیج جو جی چاہے مجھ سے کروالو۔ بقول اُن کے وہ ہر فن مولا ہیں مگر سچ یہ ہے کہ وہ صرف جیک آف آل ٹریڈز تو شاید ہیں مگر ماسٹر کسی کے نہیں۔

اپنے ہم کلم یاروں کو ناروے بلوانے کے چکر میں اُنہیں تہمد باندھے، پگڑی پر طُرہ لگائے جیسا تیسا پنجابی بھنگڑہ ناچتے بھی دیکھا گیا ہے وہ سٹیج پر بانسری وادن کے بھی کئی پروگرام دے چکے ہیں۔ دو تین رسالوں میں اپنی ٹیڑھی میڑھی گھس پیٹھ کے ذریعے ایڈیٹری یعنی بقول اُن کے مدیری بھی کر چکے ہیں۔ کہانیاں بھی لکھی ہیں جو دوسری جماعت کے قاعدہ قسم کے ایک ڈال پہ طوطا بولے، ایک ڈال پہ مینا، جیسی ہوتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

rekhta

انہوں نے پینٹنگس پر بھی ہاتھ صاف کئے ہیں۔ نجانے ہاتھ صاف کرنا، وہ کس معنی میں لیتے ہیں مگر یہ سچ ہے کہ اُنہوں نے پینٹنگس پر ہاتھ میلے ضرور کئے ہیں یعنی میلی پینٹنگس، میلے ہاتھ۔ اُنہیں شکایت ہے کہ لوگ بے قدر ہیں اور اُنکی کوئی پینٹنگ ابھی تک اُن کی مناسب یعنی مطلوبہ ہائی پرائس پر فروخت نہیں ہو سکی جبکہ سچ یہ بھی ہے کہ اپنے جیسے عقل کے اندھوں کے ہاتھ اُنہوں نے اپنی کچھ پینٹنگس بیچ کر چند سکے بھی بٹور رہے ہیں۔

"میں نے طبلے بھی بجائے ہیں"۔ وہ کہتے ہیں طبلہ بجانا، کہنا غلط ہے۔ طبلے بجانا، کہنا چاہیئے کیونکہ طبلوں کی جوڑی ہوتی ہے۔ جانے وہ کون سے طبلوں کی بات کرتے ہیں کیونکہ اُنہیں سٹیج پر طبلے یا طبلہ بجاتے آج تک کسی نے نہیں دیکھا مگر طبلوں کی بات کرتے کرتے جانے وہ کبھی کبھی کھو کیوں جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک شرارتانہ قسم کی مسکراہٹ بھی ان کے ہونٹوں پر رینگ آتی ہے جیسے یہ طبلے اندر کھاتے چھُپ چھُپ کر بجانے کی چیز ہوں۔ یار تو اِس سلسلے میں بھی اُنہیں ماسٹر نہیں جیک ہی سمجھتے ہیں۔

سٹیج پر اُنہیں لیکچر کرتے بھی دیکھا گیا ہے۔ اُنہوں نے دھرم کرم، بلکہ ہر مذہبی جلسے اور ہر محفل میں، ہر موضوع پر لیکچر پلائے ہیں۔ لیکچر پلانا، یہ سننے والوں اور اُن کے لیکچروں سے بور ہونے والوں کی اصطلاح ہے۔ مذاہب پر اُن کے لیکچر شردھالُو قسم کے لوگ تو برداشت کر لیتے ہیں مگر کبھی کبھی دورانِ لیکچر وہ دھرم کرم کی اُونچی سیڑھیوں سے اُتر کر کام شوتر کی پیچیدی، کھُردری اور ذہن کو جھٹکا دینے والی سیڑھیوں پر بھی اُتر آتے ہیں۔ تب جہاں شردھالُو قسم کے لوگوں کو تو لگتا ہے جیسے ٹھنڈی میٹھی پہاڑی ہواؤں میں کہیں کوئی تپتا جہنم کی آگ برساتا جھونکا در آیا ہو، وہاں کچھ نوجوان اور رُمشتے بالے چھوکرے ایسے گرم گرم جھونکوں سے گرمی حاصل کر کے محفوظ ہوتے، مسکراتے اور اُن سے سبق حاصل کرتے ہیں۔

ایک محفل، جس کے لئے محفل کی بجائے کوئی اور بڑا لفظ استعمال کرنا چاہیئے مگر شاد صاحب، جن کا ذخیرۂ الفاظ بہت ہی محدود ہے، اُسے محفل ہی کہتے ہیں۔ یہ 'بک ڈے' نام کا ایک ایسا بڑا میلہ ہے جو ہر سال کے اختتام پر یعنی ماہِ نومبر کے آخیر یا دسمبر کے شروع میں منعقد ہوتا ہے جس میں نارویجین قلم کار اپنی اُس سال کی شائع شُدہ کتابوں سے کوئی نظم، افسانہ یا ناول کا کوئی مختصر سا دلچسپ حصہ پڑھتے اور قاری اور قلم کار کے بیچ ایک رشتہ استوار کرتے ہیں۔ ایک بار اُس محفل میں جانے شاد صاحب کیسے اپنی ایک نظم نارویجین میں جیسے تیسے ترجمہ کر کے داخلہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ حالانکہ اُس پورے سال میں اُن کی کوئی ایک کتاب تو کیا ایک آدھ لفظ تک بھی کہیں شائع نہیں ہوا تھا۔ ہاں وہ دُوسری جماعت کے دو ریڈر قسم کے دو قاعدوں کے مصنف ضرور ہیں جنہیں وہ اپنے شعری مجموعے کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہی دِکھا کر اُنہوں نے کہیں جُگاڑ لگالی ہو۔ وہ داؤ مار لینے کو، "جُگاڑ لگا لینا" کہتے ہیں ــــ وہ تو یہاں تک بھی کہتے ہیں کہ انہیں اُن کتابوں پر ایوارڈ بھی مِل چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے سچ ہی کہتے ہوں کیونکہ آج کل ایوارڈز بھی تو اندھوں کی ریوڑیاں بن گئے ہیں جو بار بار اپنوں یا اپنی خود غرضیوں سے جُڑے ہوئے لوگوں کو دیئے جا رہے ہیں۔ لگتا ہے اُنہوں نے ہندی سے نابلد نارویجین منتظمین کو اُن ہی دو

قاعدوں میں سے ایک اُس سال کا چھپا اپنا شعری دیوان بتایا ہوگا۔

اُن کے نظم پڑھنے سے پہلے سٹیج پر تعارف کرانے کو جب اُن سے اُن کے کوائف دریافت کئے گئے تو وہ کچھ بھی نہ بتا سکے۔ اُن کا سب معاملہ تو کھچڑی تھا۔ اب کھچڑی میں سے کیسے چاول، دال اور مرچ کے دانے الگ کرکے دِکھائے جاتے۔ تعارف کرانے والے صاحب نے سٹیج پر آکر کہا۔ "اب آپ کے سامنے جو شخص اپنی کوئی چیز پڑھنے جارہے ہیں۔ اُنکے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی شخص تو ضرور ہیں مگر شاعر ہیں کہ نہیں اِس کا فیصلہ میں آپ قارئین پر چھوڑتا ہوں۔ میں اُنکے بارے میں کیا عرض کروں جب وہ خود بھی اپنے بارے میں میرے بار بار پُوچھنے پر بھی کچھ نہیں بتا سکے۔ بس اُنکے بارے اپنی طرف سے میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ بھی اِسی زمین پر پیدا ہوئے ہیں جس پر آپ اور ہم نے جنم لیا ہے۔" ہنسی کے چھوٹتے غباروں میں اُن کی نظم، غزل یا جو کچھ وہ تھی گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب ہوگئی۔

شاد صاحب کا ایک کام یہ ضرور قابلِ تعریف و تحسین ہے کہ وہ دِلوں کو ملانے کا کام بھی کرتے ہیں کوئی لڑکا کسی طرح سیاح کے طور پر، طالبعلم بن کر، پناہ کی درخواست کے ساتھ یا نوکری کی تلاش میں ناروے پہنچ گیا اور جب ہر طرح سے ناکام اور مایوس ہوگیا اور اُسے کسی طرح بھی قیام کا ویزا نہ مل سکا تو شاد صاحب نے اُسے راہ پر لگا دیا۔ نہ صرف راہ پر لگایا بلکہ اُنگلی پکڑ کر بُرے کے گھر تک بھی پہنچا آئے۔ "فی زمانہ بُرائی کے راستے پر تو ناکامی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ مجال ہے کہ جھوٹا ہم تک پہنچے اور ٹِک نہ جائے۔" وہ بڑے فخریہ انداز میں کہتے ہیں۔

شاد صاحب کہتے ہیں۔ "جب میرا نام شاد ہے تو پھر شادمانیاں بانٹنا میرا فرض ہو جاتا ہے۔"

وہ زمین کھود کھاد کر کہیں سے بھی کسی گوری رنڈی، ہاں جو پیسے لے کر دو چار سال کے لئے کرائے کی بیوی بن کر رہ جانے پر تیار ہو جائے تو اس کے لئے اور کیا الفاظ استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ اور یہ الفاظ ہمارے نہیں، خود شاد صاحب کے ہیں، کا بندوبست کرنا شاد صاحب کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے کیونکہ شاد صاحب خود چھڑے چھانٹ ہونے کی وجہ سے ایک عرصہ تک اِس میدان کے پُرانے کھلاڑی رہے ہیں مگر اس سلسلے میں بھی اُنکے کئی دوست مشکوک ہیں۔۔۔ جوڑا مل جانے کے بعد کون مائی کا لال ایسا حاکم ہوگا جو میاں بیوی کو جُدا کر سکنے کا حوصلہ کر سکے۔ بس لڑکا لڑکی وقتی طور پر سیٹ ہو جاتے ہیں۔ پھر جُدا بھی ہو جاتے ہیں۔ ملاپ اور جُدائی یعنی طلاق بعد از کام یعنی ورکنگ ویزا مِل جانے کے بعد، شاد صاحب کا بھی کچھ ہزار کرونر کا ٹلو لگ جاتا ہے۔ یہ ٹلو لگ جانا، بھی شاد صاحب کی اپنی اِصطلاح ہے جس کے معنی غالباً، داؤ لگ جانا کے ہیں۔ کبھی کبھی اُن کا پاسہ اُلٹا بھی پڑ جاتا ہے (پانسہ اُلٹا پڑ جانے کیلئے وہ یہ الفاظ استعمال کرتے ہیں) جب ایک قریبی رشتہ دار کے سلسلے میں اُن کا کوئی حربہ کارگر نہ ہو سکا تو کسی نے انہیں صلاح دی۔ اپنا بزنس کھولو اور اسے کام کا لیٹر جاری کرکے ویزا دِلوا دو۔ شاد صاحب کو بات تو جچ گئی مگر بزنس کے ننانوے کا پھیر اُن کے بس کا روگ نہیں تھا۔ بولے ـــــ جار (یار) تونے بھی خوب کہی۔ شاید اکبر الٰہ آبادی کو تم نے ابھی تک نہیں پڑھا۔ لکھتے ہیں:" اور شاد صاحب پھٹے ڈھول کے سے گلے سے گانے لگے۔

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے کہ بیٹا تو اگر کرلے ایم اے پاس
تو فوراً لیلیٰ کو بیاہ دوں تجھ سے بلا دقت میں بن جاؤں تیری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی کُجا عاشق کُجا کالج کی بکواس
کُجا یہ فطرتی جوشِ طبیعت کُجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپکو کیا ہو گیا ہے ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس

جار کجا اپنی ساعری کا جوس طبیعت اور کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس ۔ ارے بھائی میں بجنس مین بنونگا؟ ٹھوکیں لگا لگا کر نوٹ گننا مجھ ساعر کے بس کا روگ نہیں۔ تم نے بھی کیا ہرن پر گھاس لادنے کی بات کی ہے۔"

"ہاں سرکار غلطی ہوئی آپ جیسے غالب کو یہ صلاح دے بیٹھا۔ اپنے اتنے بڑے شہر میں "اتنی دور سات سمندر پار ایک آپ ہی تو غالب چچا کا جوڑ ہیں۔ اُنہیں بزنس کی دلدل میں ڈالنے کے گناہ کا مرتکب ہوا۔ معافی چاہتا ہوں۔ خیر بھائی، یُوں کرو کسی بزنس مین کے سلیپنگ پارٹنر بن جاؤ۔ پیسہ لگاؤ اور آرام سے لمبی تان کر سو جاؤ۔ ہینگ نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا۔ اُوپر سے شرط یہ رکھ دو کہ ہمارے ایک آدمی کو ویزا دلوانا ہوگا۔" ان کے صلاح کار دوست نے نئی راہ سجھائی۔

"ارے ہاں جاد آیا، اپنے جار کی ایک جار ہے۔ کبھی تھی اب تو وہاں سے سلسلہ ختم ہو چکا ہے اور دونوں الگ ہو چکے ہیں۔ محترمہ نے سنا ہے اپنا بجنس کھولا ہے۔ مجھ سے پُرانی جان پہچان ہے۔ میری ساعری کی دیوانی ہے۔ ایک دفعہ میری گجل سنی تھی تو میرے پاس دوڑی آئی تھی داد دینے کو۔ دیکھو اُس سے بات کرتا ہوں۔"

شاد صاحب نے ایک بار اُسے رنگ کیا۔ "رانی۔ مجھے سلیپنگ پارٹنر بنا لو۔ میرے پاس پیسے کی کوئی کمی نہیں۔" اُدھر سے ہنسی کا کے بتاشے چھوٹنے لگے۔ محترمہ شاید لفظ سلیپنگ پارٹنر پر ہنسی تھیں۔ شاد صاحب کچھ اور سمجھے۔ ہنسی تو پھنسی۔ اتنی آسانی سے بات بن جائے گی۔ انہوں نے سوچا تک نہ تھا۔ اور ساتھ ہی اُن کے دل میں عشق کی پہلی کونپل پھوٹ پڑی۔ پُوچھا۔ "اگلے ہفتے کی کسی شام کو کسی ریسٹورنٹ میں مل سکتی ہو؟"

"ہاں کیوں نہیں — چائنا ٹاؤن کیسا رہے گا؟ مجھے چائنیز کھانے بہت پسند ہیں۔"

"چائنا ٹاؤن" میں ملاقات اور بعد میں دونوں نے انگریزی فلم (DANCE WITH THE WOLF) دیکھی اور پھر تو جیسے سلسلہ ہی چل پڑا۔ فلمیں، ڈنرز، دعوتیں، کلب اور سیریں۔ شاد صاحب پیسے لُٹاتے رہے۔ نقد بھی پیش کئے۔ ایک دن صلاح کار دوست نے پوچھا۔ "شاد صاحب۔ کچھ کام بنا؟"

"کام بننے میں اب کیا کسر رہ گئی ہے۔ بجنس کے لئے قریباً بیس ہجار الگ سے ارپن کر چکا ہوں۔"

"صرف ساتھ بزنس کے لئے" دوست نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

شاد صاحب چونکے۔ اُن کے کانوں میں رانی کی پہلی ہنسی کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور چٹاخ سے اُن کے دل میں چھپی میٹھی عشق کی پہلی کونپل پھول بن گئی۔ ارے میں نے تو ابھی تک اُسکی انگلی تک بھی نہیں چھوئی۔ اگلی ملاقات میں شاد صاحب نے

سیدھے ہی اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُدھر سے فوراً جواب ملا۔ "ٹچ می ناٹ" یعنی جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا گیا۔

اُس سے اگلی ملاقات میں شاد صاحب نے پوچھا۔ "بزنس میں اور کتنا ڈالوں؟"

"کون سا بزنس؟" جیسے وہ سب کچھ بھول بیٹھی تھی۔

"وہی جس کا میں سلیپنگ پارٹنر ہوں۔"

"وہ تو بیٹھ چکا ہے اور آپ ابھی تک سوئے پڑے ہیں۔ اُسے اُٹھانے کے لئے دو لاکھ اور درکار ہوں گے۔"

"دے سکتا ہوں مگر کیا گارنٹی ہے کہ آپ کی بند کتاب مکمل بھی سکے گی یا نہیں۔ ابھی تک تو تم نے یہ بھی نہیں بتایا کہ تم کس چیز کا بزنس کرتی ہو۔"

"دو لاکھ یہاں سامنے میز پر رکھ دو تو بتاؤں ورنہ اِسے ایک بدصورت خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔"

"اور اگر دو لاکھ نہ دکھا سکوں تو اُن بیس ہزار کا حساب کیسے چکاؤ گی جو تم نقد لے چکی ہو؟"

"اِس کا فیصلہ تو تمہیں کرنا ہوگا مگر دھیان رہے کہ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔" اُس کی آنکھوں میں کر لو میرا کیا کرو گے، کی سی رُعب دار چمک تھی اور خود ہی جان چھڑانے کا بہانہ۔

شاد صاحب پھر صلاح کار دوست کے ہاں جا دھمکے۔ "غضب ہو گیا دوست۔ وہ تو پٹھے پر ہاتھ ہی نہیں دھرنے دیتی اور بیس ہزار بھی ڈکارے بیٹھی ہے۔"

"یار تم تو نِرے نامرد نکلے۔ بانہہ پکڑ کر ہی سب کچھ اُگلوا لیتے۔ اِن سلسلوں میں پہلے ہی دن آگے بڑھ کر اندازہ لگا لینا چاہیئے کہ اگلا کہاں تک آگے آ سکے گا۔"

"شاید میں حُسن کی وادی میں کہیں دُور اُتر گیا تھا اور آس پاس کا ہوش نہ رہا۔" شاد صاحب پھر خیالی وادیوں میں اُتر گئے۔

"شاید وہ ہی نامرد ہو ورنہ اتنے دن تمہارے ساتھ ریستورانوں میں کیا بھجن گانے جاتی رہی ہے۔" دوست بولا۔

"مگر میرے بیس ہزار؟"

"وہ ٹھیک کہتی ہے۔ اُسے ایک بدصورت خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔" دوست بولا۔ "سمجھ لو کہ وہ جنس کی وہ بند کتاب ہے جس کا سرورق بڑا دلکش، قیمت بہت زیادہ اور کھولنے والی جگہ سٹیپل سے بند ہوتی ہے۔ قیمت ادا کرو۔ کھولو اور اندر چند ننگی تصویریں اور فضول سی بے لذّت بک بک۔ دوست شکر کرو سستے چھوٹے۔ اچھا اُسے اب بھول لو اور کوئی نئی گمبل لکھی ہو تو سناؤ۔"

زخموں کے سوداگر

اس لڑکی جب بھی مجھے یاد آتی ہے، میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے، ہاتھوں پر رعشہ طاری ہو جاتا ہے، زبان میں لکنت آجاتی ہے اور ہاتھ کے تمام کام غلط سلط ہونے لگتے ہیں۔ وہ لڑکی اتنی خوبصورت ہے کہ اُسے فرشتے بھی حاصل کرنے کے لئے جنّت کا عیش و آرام چھوڑنے کو تیار ہو جائیں۔ پہلے میں بھی اُسے دیکھ کر اپنے ہوش کھو بیٹھتا تھا۔ مگر تب بات اور تھی۔ اب اگر اُسے میں دیکھ لوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میرے وجود میں کوئی شیطان پناہ گزیں ہو گیا ہے جو مجھے قتل کی ترغیب دے رہا ہے۔ تم کہتے ہو الٰہ آباد میں میرا آبائی گھر ہے۔ پھر میں نے جان بُوجھ کر وہاں سے تبدیلی کیوں کروائی۔ مگر تمہارے اس سوال سے مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کوئی میرے زخموں کو کُھرچنے پر تُلا ہوا ہو جس سے میرے اندر پھر ایک شیطان جاگ اٹھا ہو۔ جو کہتا ہو:

"چلو الٰہ آباد اور بنا دو اسے گولی کا نشانہ۔ پھر چاہے خود پھانسی پر ہی جھول جاؤ، مگر ایک بار اس کا وجود ضرور اس دنیا سے مٹا دو۔ جس کے بوجھ سے دھرتی کی چھاتی بھی کھل کر سانس نہیں لے سکتی!"

تم حیران آنکھوں سے میری جانب کیوں دیکھ رہے ہو؟ اس لئے نا کہ ایک خوب صورت لڑکی کی یاد کے ساتھ غصّے سے خون کا کھول جانا کیا معنی رکھ سکتا ہے؟ خوب صورتی کے ساتھ تو عشق کا جذبہ اُبھرنا چاہئیے۔ تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔ میں نے بھی اس لڑکی سے پیار کیا تھا۔ دل کی ساری دنیا سے اُسے چاہا تھا، خدا سے دن رات دُعائیں مانگی تھیں کہ خدایا اگر تو وہ لڑکی مجھے بخش دے تو باقی تمام عمر تجھ سے اور کچھ نہیں مانگوں گا۔ مگر خدا کے یہاں رشتے شاید پہلے سے ہی طے ہوتے ہیں۔ مذہب کی، چھوٹے بڑے کی اُونچ نیچ کی دیواریں رہی سہی کسر بھی پوری کر ڈالتی ہیں۔ وہ پکا پھل کسی اور نامعقول، بدطینت اور شیطان صفت انسان کی جھولی میں گرنا تھا۔ بس یہ سب غصّہ مجھے اسی شیطان پر آتا ہے، جب دیکھتا ہوں کہ کیسے اس نے ایک ہری بھری پھلواری میں آگ کے شعلے بھڑکا کر کسی کی دنیا ہی ملیامیٹ کر کے رکھ دی۔

اس لڑکی کو میں نے پہلی بار بازار میں سبزی اور پھل خریدتے ہوئے دیکھا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اُس نے بھی مجھے دیکھا تھا یا نہیں، مگر میں کسی انجانی طاقت سے کشاں کشاں دور اندر محلے تک اس کے پیچھے کھنچا چلا گیا۔

rekhta

محلہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ میں کئی دفعہ ان گلیوں سے گزرا تھا۔ وہ جب ایک تنگ گلی میں مڑی تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ وہ — وہ کہیں — ہاں، وہ اسی گھر کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی جس میں، میں کئی دفعہ آچکا تھا۔ وہ روشن کا گھر تھا وہ پنجابی بڑا میرا بہت ہی بے تکلف، ہم نوالہ، ہم پیالہ قسم کا دوست تھا۔ اردو کو بھی پنجابی کے لہجے میں بولتا تو مزہ آجاتا۔ اس کی باتیں ہی پُر لطف اور وزن دار ہوتیں کہ رگوں میں دورانِ خون تیز ہو جاتا۔ ہم محکمۂ معدنیات کے ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ صرف شعبے جُدا تھے۔ ایک ہی جیپ پر ہم دَورے پر جاتے تھے۔ جب کئی کئی دن باہر رہ جانا پڑ جاتا تو ایک ساتھ کھانا پینا ہوتا۔ یہی نزدیکی ہمارے دلوں کو قریب لے آئی تھی۔ وہ شاید اکتوبر کا مہینہ تھا۔ سردی بگڑے زکام کی طرح ہولے ہولے دھرتی کی چھاتی میں اُتر رہی تھی اور ہر گھر میں کوئی نہ کوئی نزلہ، فلو یا بخار سے چارپائی پر پڑا تھا۔ روشن بھی سخت بیمار رہا۔ میں نے اُس کے علاج معالجہ میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ جب وہ قدرے ٹھیک ہوا تو میری ماں نے ایک غریب بوڑھی عورت کو اس کے گھر میں نوکرانی رکھوا دیا۔ کیوں کہ اُسے پرہیزی اور مناسب غذا کی ضرورت تھی، جو بازار سے دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ بڑھیا نے اُسے ماں جیسا پیار دیا اور شاید روشن نے بھی بیٹے جیسا۔ میں جب وہاں جاتا۔ دونوں مجھے اچھے سے اچھا کھلائے پلائے بغیر جانے نہ دیتے۔ یہ سلسلہ کئی دن چلتا رہا۔ وہ بوڑھی عورت جیسے اس گھر کا ایک فرد ہی بن کر رہ گئی۔ مگر ایک دن میں نے اُس گھر میں ایک اور فرد کو دیکھا۔ وہ روشن کے لئے چائے کا پیالہ لا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ پیالہ پل بھر کے لئے اُس کے ہاتھوں میں کانپا۔ پھر لجاتی، شرماتی، پیالہ روشن کے سامنے میز پر رکھ کر وہ اندر چلی گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے بے موسم کی بجلی دُور کہیں آسمان کی وسعتوں میں کوندی ہو اور بُجھ گئی ہو۔

"روشن؟" میں نے آنکھوں سے پوچھا۔

"ماں کی بیٹی ہے۔" وہ جھینپ کر بولا۔

میں کھل کر ہنسا۔ "سب ماں کی ہی بیٹیاں ہوتی ہیں۔"

میری ہنسی ایک دم بند ہوگئی، جیسے میرے جبڑوں میں کسی نے کیل ٹھونک دی ہو۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی چائے کا دوسرا پیالہ لئے پھر اندر آرہی تھی۔ اس کے جانے کے بعد چائے سُرکتے ہوئے پھر میری آنکھوں نے پوچھا۔ "روشن؟"

"بتایا تو ہے کہ وہ ماں جی کی بیٹی ہے۔" اس نے اپنے مخصوص، کرخت، پنجابی لہجے میں کہا۔

میں ٹھیٹھ یوپی کا بزدل بھیّا۔ دوسری بات بھی میری آنکھوں نے کہی۔

"آگ اور پٹرول ایک ساتھ؟ ایک ہی گھر میں؟"

اُس پنجابی مونہہ پھٹ نے مجھے گالی دی۔ "تو بہت کمینہ ہے۔"

اُس کی گالی جیسے ایک تالہ تھی، جو کھٹاک سے میرے ہونٹوں پر آ لگا۔ لیکن خیالات ایک لاوے کی طرح میرے اندر ہی اندر کھولتے رہے۔ دیگچی پر جب ڈھکنا رکھ دیا جائے تو پانی اور زیادہ تیزی سے اُبلنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر وہ سب ڈھکنے وغیرہ اُتار کر خود ہی پھینک دیتا ہے میرے اندرونی اُبال نے بھی اس وقت سب بندشیں،

سب خدشے، سب ڈھکنے وغیرہ اُتار کر ایک طرف رکھ دیئے۔ جب چھ مہینے بعد میں نے اس لڑکی کو بھاری پاؤں کے ساتھ گلی میں سے گزرتے دیکھا۔ میں نے دوسرے لوگوں کی نظروں میں بھی شک کی پرچھائیاں دیکھیں اور محلے میں اندر اندر ایک غصے کی لہر بھی دوڑتی محسوس کی۔ میری آنکھوں نے پھر روشن سے پوچھا۔ "اب؟"

وہ خاموش رہا اور اس کی خاموشی نے میرے ہونٹوں پہ لگے تالے کو توڑ دیا۔ میں نے اُس جیسی دلیری سے اُسے گالی دی۔ "کمینے تو نے یہ کیا کیا؟"

"دوست تم مجھے گالیاں دو، جُوتے مارو، مگر میری مشکلیں بھی تو آسان کرو۔ یہاں میرا اور کون ہے؟" اُس نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں، تمہارے گناہوں کا میں بھی حصہ دار بنوں؟" میں نے اُس کے ہاتھوں کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ "میں یہاں کا رہنے والا ہوں۔ سب ڈاکٹروں کو جانتا ہوں نا ـــــ اس لیے؟"

"بکواس بند کرو۔" وہ پھر ایک دم بھڑک اُٹھا۔ "مجھے تمہاری کسی مدد کی ضرورت نہیں اور نہ میں تمہارے ڈاکٹروں کی طبی امداد کا خواہش مند ہوں۔ میں حیران ہوں کہ تم ایک عرصے میری دوستی کا دم بھرتے رہے۔ مگر مجھے ابھی تک پہچان نہیں سکے۔ وہ میری بیوی ہے۔ نصف بہتر ـــــ ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ تم لوگ اگر سات پھیرے لینے کو ہی سرٹیفکیٹ مانتے ہو تو میں تم لوگوں کا مونہہ بند کرنے کو یہ رسم بھی پوری کردوں گا۔ باقی اُونچ نیچ، چھوٹا بڑا، امیری غریبی، ذات پات، یہ تو خود ہماری ہی اُٹھائی ہوئی دیواریں ہیں۔ جنہیں سماج کے بُوڑھے ٹھیکے داروں نے مضبوط بنایا ہے تو کیا ہم اپنے جوان ہاتھوں سے اُنہیں گرا نہیں سکتے؟"

جیسے تالا پھر اُس نے واپس میرے لبوں پر لگا دیا۔ مگر اب مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے تمام جذبات ایک قیمتی خزانے کا رُوپ بھر کر میرے اندر اُس تالے میں محفوظ ہو گئے ہیں۔ میں اور میری ماں پھر سینہ سپر ہو کر محلے والوں کے طوفان کے آگے ڈٹ گئے۔ بڑی منتوں، سماجتوں اور حیلوں سے لڑکی کی ماں کو منانے کے بعد ہم نے سات پھیروں کی رسم بھی ایک سنسان مندر میں پوری کرادی اور روشن چھ مہینے بعد ایک بچی کا باپ بن گیا۔

شہر کے ایک روزنامے نے اونچ اور نیچ کے بیچ گرتی ہوئی اس دیوار کے بارے میں تعریف کُن سُرخی کے ساتھ یہ خبر چھاپی۔

روشن کی گھریلو زندگی اب چین سے گزر رہی تھی۔ ایک خوب صورت پیار کرنے والی بیوی، ایک کھلونا سی بچی اور ایک ہر وقت خدمت کے لئے تیار ساس سے گھر بھرا پُرا لگتا تھا۔ جہاں ہنسی کے فوارے چھوٹتے تھے، خوشیوں کے پھول کھلکھلاتے تھے اور زندگی اپنی تمام رنگینیوں کے ساتھ جلوہ فگن تھی۔ میری اکثر شامیں بھی وہیں گزرتی تھیں۔ میری چائے اب سادہ چائے نہیں ہوتی تھی۔ اکثر اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ لوازم بھی ہوتے تھے۔ محلے والے اب بھی روشن سے ناراض تھے۔ مگر میں، میری ماں اور اس کی ساس ایک ڈھال کی طرح ہمہ تن اس کی حفاظت پر مامور ہو گئے تھے جس کی وجہ سے کسی کو اس سے کچھ کہنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ لیکن ایک دن ـــــ

میں کافی دن دورے پر باہر رہا پھر وہیں سے چار مہینے کی چھٹی پر گاؤں چلا گیا۔ اس بیچ روشن بھی کئی مرتبہ اپنے ماں باپ کے پاس پانی پت گیا تھا۔ شاید وہ بہو کے لئے ان کے دل میں جگہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھٹی سے آنے کے بعد اپنی ذاتی اور دفتری مصروفیات کے باعث میں کئی مہینے تک روشن کے گھر نہ جا سکا اور پھر ایک دن وہ خوب صورت لڑکی مجھے اُس کے گھر لے گئی۔ ہاں وہ روشن ہی کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ میں بھی ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ روشن گھر پر ہی موجود تھا۔ اس کے چہرے پر اُداسیوں کا لیپ تھا۔ میں نے بے تکلف دوستانہ انداز میں پوچھا۔ "روتے کیوں ہو؟"

اس نے کوشش کر کے مسکراتے ہوئے میری طرف مظلوم نظروں سے دیکھا۔ اندر سے چوں چوں جیسے دو چڑیوں کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر وہ آوازیں نزدیک ہوتی ہوئی نسوانی بنتی گئیں۔ کوئی کوئی لفظ میرے پلے پڑا۔

"شادی... میں بھی.... پھر کیا ہے.... میرا گھر....."

میں نے روشن سے پوچھا۔

"کیوں کوئی آیا ہوا ہے؟"

"ہوں —— ہاں نہیں" وہ ہکلایا۔ کچھ دیر بعد وہی لڑکی پیالہ ہاتھوں میں لئے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی اندر داخل ہوئی۔ مجھے دیکھ کر پیالہ بری طرح اُس کے ہاتھوں میں کانپا، مگر وہ سنبھلی۔ پیالہ روشن کے آگے میز پر رکھ کر وہ واپس اندر بھاگ گئی۔ شاید اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

انجان بنتے ہوئے میری آنکھوں نے پوچھا "کون؟"

"پنجاب سے آئی ہے" روشن بولا۔

"کون ہے؟" اب میری زبان نے سوال کیا۔

"تمہاری بھابھی"

"بھابھی" جیسے زن سے کوئی چیز میرے سر سے ٹکرائی اور مجھے ایسے لگا جیسے مجھے چکر کھانے والے جھولے میں بٹھا کر کسی نے اُسے زور سے گھما دیا ہے۔ مجھے آس پاس کی ہر چیز گھومتی محسوس ہوئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو کچھ دیر پہلے اندر بولی ہوئی وہی نسوانی آوازیں زوں زوں کر کے پھر میرے کانوں میں بجنے لگیں۔

"شادی.... میں بھی.... پھر کیا.... میرا گھر....."

"روشن! یہ تو نے کیا کیا؟" میں بس یہی کچھ کہہ سکا۔

"اور کیا کرتا؟ ماموں جان بہت زور ڈال رہے تھے"

"تم نے ماں باپ کو پہلی شادی سے آگاہ نہیں کیا تھا؟" میں نے سیدھے سیدھے پوچھا۔

"نہیں، میں زمین تیار کر رہا تھا کہ ماموں جان مجبور کرنے لگے۔ میرے ماں باپ مان گئے اور میں نے ان کی خواہش کے آگے سر جھکا دیا"

"مگر تم سچ بول کر جان چھڑا سکتے تھے۔ صاف کہہ دیتے کہ میں پہلے ہی شادی کر چکا ہوں۔"

"نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح ماموں جان کا دل ٹوٹ جاتا۔ کیوں کہ ان کی لڑکی کی عزت اور زندگی کا سوال تھا۔"

"تو کیا بھابی تمہارے سگے ماموں کی لڑکی ہے ؟"

"ہاں۔"

"مگر ہندوؤں میں تو ایسے رشتے نہیں ہوتے۔"

"کبھی کبھی ہو بھی جاتے ہیں۔"

"کہیں تم نے جان بوجھ کر . . . ." میں نے اپنی زبان کو روکا اور صرف اتنا کہا۔ "تم نے بہت بڑا ظلم کیا ہے، روشن۔ بہت بڑا اندھیر۔ خدا تمہیں معاف نہیں کرے گا۔" میں اس کے روکنے کے باوجود اس کے گھر سے باہر نکل آیا۔

میں دو دن تک دفتر نہیں جا سکا۔ پچھلے واقعات کی گاڑی اپنے گھر درے پہیوں سے میرے ذہن کی صاف شفاف مال روڈ پر دندنانے لگی۔ اوشا اور انیل مجھے بار بار یاد آنے لگے۔ اوشا یہی لڑکی، کبھی دہلی کالج میں میری ہم جماعت رہی تھی۔ میں نے اُسے دل کی ساری دنیا سے چاہا تھا۔ خدا سے زندگی بھر کے لئے صرف ایک خواہش کی تھی، اوشا کے پیار کی۔ مگر نہیں، وہ مجھے نہیں، میرے ہی دوست انیل کو چاہتی تھی۔ وہ ریڈیو پر ٹیکنیشین تھا۔ بہت اچھا شاعر بھی تھا۔ میں نے جب اُسے اُوشا سے ملتے جلتے دیکھا تو اپنے سینے پر پتھر کی سل رکھ کر اُس کا خیال ہی ترک کر دیا۔ اُوشا کا خیال چھوڑتے ہوئے مجھے بہت بڑی ذہنی اذیت سے گزرنا پڑا۔ بیمار بھی ہو گیا۔ مگر دل پر جبر کر کے میں نے قسم کھائی کہ تا زندگی شادی ہی نہیں کروں گا۔ اس طرح اپنی محبت کی زندگی میں خود ہی اپنے ہاتھوں آگ لگا کر میں الٰہ آباد آ گیا۔ یہاں آہستہ آہستہ میں حالات کے سانچے میں ڈھلتا گیا۔ روشن کی دوستی نے میرے دل سے اُداسیوں کی گھٹائیں چھانٹی شروع کر دیں۔ میں اس کے بہت قریب آتا گیا۔ اتنا کہ لوگوں کے یہ کہنے کے باوجود کہ روشن چال چلن کا کچا ہے۔ میں اپنی ضد پر اڑا رہا، بلکہ اُلٹا ان سے لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا۔ میری نظر میں وہ ایک فرشتہ تھا، جس پر لوگ صرف 'باہر کا' ہونے کی وجہ سے الزامات لگا رہے تھے۔ میرے دل پر اس وقت اس کی عظمت کی چھاپ سی جم کر رہ گئی، جب اس نے غریب دروپدی سے پیار اور پھر شادی کر لی۔

روشن کے ہاں میرا آنا جانا تقریباً بند ہو گیا۔ وہ بہت ہی خودغرض اور نیچ انسان ثابت ہوا۔ اتنا نیچ کہ جان بوجھ کر اُس نے اپنے سگے ماموں کی لڑکی سے شادی کی تاکہ رشتہ داری کے دباؤ سے وہ اوشا اور اس کے باپ یعنی اپنے ماموں جان کو اپنے پہلے گناہ کے ظاہر ہو جانے پر کچھ کہنے یا کرنے کا موقع ہی نہ دے۔ کیونکہ وہ اگر کہیں باہر شادی کرتا تو دو شادیاں کرنے پر سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے نوکری سے برخاست ہو سکتا تھا۔ اپنے سگے ماموں سے اُسے ایسی کسی شکایت کا بہت کم اندیشہ ہو سکتا تھا۔ مگر پھر بھی انسان کو کمینہ اور گرا ہوا نہیں ہونا چاہیئے کہ معمولی سے عیش یا آرام کی خاطر بیک وقت کئی کئی بے گناہ انسانوں کی زندگیوں سے کھیلے۔ اگر اُسے اوشا سے ہی عشق تھا تو پھر اسے

اس غریب دروپدی، اُس کی ماں، اُس کی ڈیڑھ سالہ بچّی، اُس کے ہونے والے بچے، اوشا اور اس کے باپ کی زندگی سے کھیلنے کا کیا حق تھا؟

میرا دل کئی دن تک بے چین رہا۔ ایک سانپ سا کنڈلی مارے ہر وقت ذہن پر سوار رہتا۔ اوشا کی مظلومیت پر دل آٹھ آٹھ آنسو رویا کرتا۔ دل چاہتا کہ کسی طرح اُس مظلوم کو راون کے چنگل سے آزاد کرا دوں جانے وہ غریب کب تک اس دوزخ میں زندہ رہ سکے۔ شاید روشن کو میرے دل کے چور بھاٹے کا علم ہو گیا تھا۔ دوست وہ اچھا جو پاس رہتا ہو، اور دشمن وہ بُرا جو پاس رہتا ہو۔ میں کل تک اس کا اچھا دوست تھا۔ تو اب بُرا دشمن بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ بُرے انسانوں کو بُرائی نبھانے کے لئے بُرے ہی راستے سُوجھتے ہیں۔ اُس نے مجھ سے ایک نئی دوستی کا آغاز کیا۔ وہ گِر چکا تھا۔ اُس نے مجھے بھی گِرا ہوا سمجھ لیا۔ ایک دن دفتر میں مجھ سے بولا۔ "میں دورے پر جا رہا ہوں۔ تم اوشا کو سنگم اشنان کرا لانا۔

"کیا اوشا کو سنگم کل ہی لے جانا ضروری ہے" میں نے دل میں سوچا۔

"تم اُسے سنگم اب تک کیوں نہیں لے گئے؟" یا واپس آ کر کیوں نہیں لے جا سکتے؟ آخر کل کوئی تیوہار بھی تو نہیں"

میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اُس نے مزید کہا۔

"شام کو تم اسے شاپنگ بھی ضرور کرا دینا۔ اسے کچھ کپڑے خریدنے ہیں"

"کپڑے تو عورتیں اپنے خاوند کے ساتھ ان کی پسند سے ہی خریدنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ میرے دل نے سوچا، مگر زبان نے بس اتنا کہا۔

"تم خود بھی تو . . . ."

"اور بعد میں نائٹ شو دکھانا نہ بھولنا۔ وہ فلم دیکھنے کی بہت خواہش مند ہے"

میرا دل چاہا کہ اس کے ایک زنّاٹے دار طمانچہ رسید کروں اور کہوں "اُلّو کے پٹھّے! تو نے مجھے بھی اپنی ہی طرح پنچ اور کمینہ سمجھا ہے؟ رشوت سے میرا مونہہ بند کرنا چاہتا ہے۔ یاد رکھ میں تجھ سے اس توہین کا بدلہ ضرور لوں گا"!

میں کمزور سا انسان ہوں۔ ایک بے ضرر ادیب۔ میرا کام تخلیق ہے، تخریب نہیں۔ میں کسی کا گھر بسا تو سکتا ہوں، اُجاڑ نہیں سکتا۔ مگر دروپدی اور اوشا کی مظلومیت بھی نہیں دیکھی جا سکتی تھی۔ اُنہیں اس گورکھ دھندے سے رِہا کرانے کے ہزاروں طریقے سُوجھتے، مگر ادیب ذہن اُنہیں رد کر دیتا۔

خدا بڑا کارساز ہے۔ وہ سب کی مشکلیں آسان کرتا ہے۔ اُس نے میری بھی راہیں ہموار کر دیں۔ دوسرے دن میں نے روشن کی ہدایت کے مطابق اوشا کو گھمایا پھرایا تو نہیں، مگر اُس کے دماغ میں پھیر ضرور ڈال دیا کہ وہ کسی طرح اُس قصائی کی چھری تلے سے نکل بھاگے۔

کچھ دن بعد میری ڈیوٹی روشن کے ساتھ ایک ہی گاؤں میں لگی۔ جیپ پر ہم کو سبا ہیڑی جانا تھا۔

صبح کو جیپ پر جب میں اور ڈرائیور روشن کے گھر کے پاس پہنچے تو دُور ہی سے ہم نے اس کے دروازے پر ایک بہت بڑا ہجوم دیکھا۔ قریب جانے پر ہم نے دیکھا کہ ایک لمبا دھڑنگا چھ فٹ کا جوان ہولڈال، اٹیچی کیس، ٹرنک اور دوسرا سامان اُس کے گھر سے باہر نکال نکال کر سڑک پر ڈھیر کر رہا تھا۔ اور اُونچی آواز میں اُوشا سے کہہ رہا تھا۔

"تم مجھے راکھی کس لئے باندھتی ہو؟ میں مر گیا تھا کہ تم چُپ چاپ اس شیطان کے چنگل میں پڑی رہیں"؟

روشن بھیگی بلّی بنا، آنکھیں نیچی کئے باہر نکلتے ہوئے سامان اور گلی میں بہتی عزّت کو حسرت و یاس سے تک رہا تھا۔

مالکِ مکان کی بیوی پڑوسن سے کہہ رہی تھی۔

"ہائے میں مر گئی۔ مُوا کہتا تھا، دہلی سے میری بہن آئی ہوئی ہے من میں کالک تھی نا۔ اسی لئے دونوں کو باہر نہیں نکلنے دیتا تھا"۔

"اور بہن آوازیں تو ان کے گھر سے ایسے آتی تھیں جیسے لام لگی ہوئی ہو"۔ پڑوسن کہہ رہی تھی۔

"لام ہی تو لگے گی بہن"۔ تیسری نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا تھا۔

"جب کسی کا گھر جلتا ہے تو وہ کیا کچھ نہیں کر گزرتا"۔

"مگر اس بے شرم نے کیا کیا! پہلے دروپدی سے شادی کر کے بھلے ہمدرپرش کا ڈھونگ رچایا، مگر ابھی بے چاری کے ہاتھوں کی مہندی ہی نہیں اُتری تھی کہ اس پر سوکن لا بٹھائی"۔ ایک اور نے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"اس غریب نے ابھی زندگی کا دیکھا ہی کیا تھا"۔ ایک اور نے راگنی الاپی۔

"ایسے کو تو گولی مار دینی چاہیئے"۔ ایک بزرگ بولا۔

نوجوانوں میں سے ایک نے شہ پا کر کہا

"دیکھتے کیا ہو ذرا کر دو ہڈیاں سیدھی"۔

جوان طبقے میں طوفان آنے سے پہلے جیسی حالت پیدا ہوئی۔

جھنڈا سنگھ نے جو علاقے کا بدمعاش تھا، بڑ بڑ، بڑ بڑ، جیسی کوئی عجیب آواز نکالی جس نے جوان خون میں جوش کی ایک لہر پیدا کر دی۔ شیر کی پہلی ہی گرج سے گیدڑ جھاڑیوں میں جا چھپا۔ روشن اپنے مکان کے قلعے میں پناہ گزیں ہو گیا۔

ڈرائیور اور میں کچھ دیر جیپ روکے اوشا اور اُس کے بھائی کو سامان رکشا پر لادتے دیکھتے رہے۔

اچانک اوشا اور سامان کو چھوڑ کر وہ نوجوان میرے قریب آیا اور بولا۔

"آپ روشن کے افسر ہیں نا؟ میں اس کی رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ میں اوشا کو چھوڑ کر آپ کے دفتر آؤں گا"۔

ڈرائیور کہیں چغلی نہ لگا دے اس لئے میں نے انگریزی میں اُسے جواب دیا۔

"رپورٹ سے کچھ نہ ہوگا۔ آپ لڑکی کی آئندہ زندگی کے لئے کچھ کیجئے۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا کہ لڑکی کو تو چکلے خانے سے نکال لیا۔"

وہ واپس رکشا کی طرف بڑھ گیا۔ میرے اشارے پر ڈرائیور نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔ خود میرے اندر بھی ایک جوالا مکھی پھوٹ پڑا ــــ اُف خدایا! سات انسانوں کے قاتل کی تیرے پاس کیا سزا ہے؟ تیرے انصاف کا مندر آج سنسان کیوں ہے؟ اچانک انیل ایک روشنی کی کرن کی طرح میرے ذہن کے پردوں پر نمودار ہوا۔ دفتر پہنچتے ہی تمام حالات سے اُسے آگاہ کرنے کے لئے کاغذ اور قلم اٹھایا ہی تھا کہ چپڑاسی اندر آیا۔

"صاحب، آپ کا خط۔"

خط دیکھ کر میں تمام جان سے کانپ گیا۔ اُس کا ایک کونا پھٹا ہوا تھا۔ ڈرتے ڈرتے میں نے خط کھولا۔

اُف! انیل اب اس دنیا میں نہیں تھا۔

"روشن تمہارے مقتولین میں ایک اور کا اضافہ ہوا۔" میں نے دکھی دل سے سوچا اور اسی کاغذ پر لمبی چھٹی کے بعد تبدیلی کی درخواست دے دی۔

سلگتے آنسو پگھلتے پتھر

وہ شام کتنی رنگین تھی نرمل . . . . ایسی رنگین شام تمہارے لئے نئی اور انوکھی تھی، دنیا کے لئے نہ نئی تھی، نہ انوکھی، کیوں کہ دنیا ہر لڑکی کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسی شام کی رنگینی مدتوں سے دیکھتی آرہی ہے. تم دلہن بنی تھیں. تمہارے گھر کے دروازے پر پھولوں کے گیٹ میں تمہارے خوابوں کے شہزادے کو خوش آمدید کہنے کے لئے بجلی کے قمقموں سے "سواگتم" لکھا گیا تھا. گھر سجایا گیا تھا. تمہاری سکھیوں نے، جن میں میں بھی پیش پیش تھی، تمہیں سجا سنوار کر کسی مدھ بھرے جزیرے کی ملکہ بنا دیا تھا، جس کو ایک خوب صورت دیش کا شہزادہ اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آرہا تھا. یہ سب کچھ ہوا تھا کوئی نئی بات نہ تھی. ہر روز ڈولے اٹھتے ہیں. ہر روز براتیں ہوتی ہیں. مگر نرمل اس کے علاوہ جو بات تمہارے ساتھ ہوئی تھی وہ بالکل نئی، ان دیکھی اور ان سنی تھی. کم از کم میں نے اپنی چھوٹی سی عمر میں ایسا واقعہ کبھی نہیں دیکھا تھا. اس طرح کی کوئی خبر اگر کسی اخبار میں نظر سے گزری بھی تو میں نے اسے ایڈیٹر کی گپ اور اخبار کی خانہ پری سے زیادہ کبھی اہمیت نہیں دی. مگر تمہاری زندگی میں جو یہ زلزلہ میرے سامنے آیا تو میں تلملا اٹھی تھی. تم اور میں ایک ساتھ پڑھی لکھی تھیں. ایک ساتھ ہم نے خواب دیکھے تھے. اس لئے تم ــــ اور تم بنا سہاگن بنے، بنا ڈولی میں بیٹھے، بنا پنڈتوں کے منتروں کے درمیان پوتر اگنی کے ارد گرد چکر لگائے بیوہ قرار دے دی گئیں. اور اس بیوگی کی راکھ کو تمہارے اپنے ہاتھوں نے خود اپنی مانگ کے سیندور کی جگہ بھرا تھا ــــ کیوں کہ صبر کی تمام حدیں پھلانگ کر تم ہی نے تو اس سے کہا تھا: "تمہیں ریڈیو گرام چاہیے؟ ریفریجریٹر چاہیے؟ کار چاہیے؟ تو پھر یہاں کیوں آئے ہو؟ کسی بڑے گھر کی راہ دیکھو." یہ کہہ کر تم نے اپنے چہرے پر سے سہاگ کا سندر سہرا نوچ ڈالا تھا. اور تمہارے بزرگوں نے لڑکے والوں کے آگے ہاتھ جوڑ کر یہ رشتہ کرنے سے انکار کر دیا تھا.

ٹھیک ہے نرمل. تمہاری جگہ میں ہوتی، رانی ہوتی، رما ہوتی، رضیہ، روزی یا اور کوئی بھی لڑکی ہوتی، تو وہ بھی شاید یہی کچھ کرتی جو تم نے کیا. آخر ایک مردے سے کون شادی کرنا پسند کرے گا؟ جس کے اندر انسانی جذبات کی گرمی نہ ہو، محبت کا جواب نہ ہو، جو زندگی کا ساتھی مال و دولت کو سمجھے، انسان کو نہیں، وہ مردہ نہیں تو اور کیا ہے؟

rekhta

تمہارا ہونے والا شوہر بھی تو لالچ کے گھوڑے سے ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھ سکا۔ تو پھر تم مُردے کی سہاگن کیسے بنتیں، مُردے کی بیوہ تو بنا جا سکتا ہے،

کچھ عرصہ بعد تم اپنا دکھ بھول کر پھر ہمارے کالج میں داخل ہو گئی تھیں۔ مگر اب تم وہ نرملا نہ تھیں جس کی چنچلتا کے افسانے سارے کالج میں مشہور رہتے۔ پہلے نئے آنے والوں کو فرسٹ ایپرل فول بنانے میں تمہاری رائے کا خاص خیال رکھا جاتا تھا مگر اب تم پر سنجیدگی چھا گئی تھی۔ تم نے اچھا کیا کہ اپنے ہونے والے خاوند کو ٹھکرا دیا۔ کیوں کہ وہ بہت ہی لالچی تھا۔ اُسے تمہاری نہیں تمہارے گھر سے ملنے والے جہیز کی چاہ تھی۔ تم نے اس کی چال کامیاب نہ ہونے دی۔ لیکن تمہارا یہ قدم تمہارے لئے بھی گھاٹے کا سودا ثابت ہوا۔ تمہاری جرأت نے تمہارے ماں باپ کو پریشانیوں کی چکی میں پیس ڈالا۔ پیسہ الگ برباد ہوا۔ خود تمہارے چہرے کی مسکراہٹ اور گالوں کے رنگ کے ساتھ ساتھ تمام شوخی اور چنچلتا بھی اُڑ گئی۔

کئی مہینے بعد آخر تمہاری زندگی میں پھر ایک روشن دن آیا۔ پھر تمہیں لینے کے لئے کوئی تمہارے گھر آنے والا تھا۔ تمہارے گھر کو پھر اسی طرح سجایا گیا تھا۔ اسی طرح تم پھر دُلہن بنی تھیں۔ نہ چاہنے کے باوجود بھی تم والدین کی خواہشات کی قربان گاہ پر قربان ہونے کو تیار ہو گئی تھیں۔ مگر اب تم سہمی سہمی تھیں۔ اور ہم سب بھی ڈری ڈری تھیں۔ تمہارے سب رشتہ دار اور والدین چُپ چُپ تھے۔ خوشی کا موقع تھا۔ مگر خوشی نام کی کوئی چیز کسی آنکھ، کسی ہونٹ یا کسی چہرے پر نظر نہیں آتی تھی۔ فرض کے کولہو میں جُتا ہر کوئی کام کئے جا رہا تھا۔ ہر کوئی چاہتا تھا کہ تم خیریت سے ڈولی میں بیٹھ کر اپنے پیا کے گھر چلی جاؤ۔ کیوں کہ تمہارے پہلے منگیتر نے دھمکی دی تھی کہ وہ یہ شادی ہرگز نہیں ہونے دیگا تمہارے ماں باپ ڈرپوک نہیں تھے۔ تم بھی اس لالچی کتے کی پرواہ نہیں کرتی تھیں مگر سب ڈرے ہوئے تھے کیونکہ معاملہ ایک لڑکی کا تھا۔

برات آنے میں کافی دیر ہو چکی تھی۔ سب لوگوں کی آنکھیں فرشِ راہ بنی ہوئی تھیں۔ مگر دُور دُور تک کہیں کسی پٹاخے یا بینڈ باجے کی آواز نہ تھی۔ ایک ہَول سا اندر اندر سب کے دلوں میں ایک سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد جب ایک آدمی لڑکے والوں کی طرف دوڑایا گیا تو وہاں سے اطلاع آئی کہ وہ لوگ شام کا کھانا اشوکا ہوٹل میں کھائیں گے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ تو دیر ہو ہی جائے گی۔ انہوں نے یہ بھی کہلا بھیجا کہ برات کے آتے ہی ٹیکسیاں تیار ملنی چاہئیں، سارا بندوبست مکمل ہو۔

نرمل تمہارے پتا جی ایک معمولی کلرک تھے، انہوں نے اشوکا ہوٹل کی شکل تک بھی نہ دیکھی تھی۔ اور شاید اگلے سات جنموں تک بھی نہ دیکھ سکتے مگر انہوں نے چھاتی پر صبر کی بھاری بھرکم سِل رکھ کر تمہارے سسرال والوں کی یہ شرط اس طرح بے جھجک منظور کر لی۔ جیسے وہ کسی بہت بڑی ریاست کے راجہ ہوں۔ ٹھیک تو ہے، ان کی لڑکی کی شادی ہو اور برات اشوکا ہوٹل میں کھانا نہ کھائے! حد ہے، تم نے بولنا چاہا تھا، مگر تمہاری ماتا جی نے تمہارے پاؤں پکڑ لئے تھے۔ اور پھر تم نے اپنی زبان پر تالے لگا دیئے تھے۔ سب کچھ دیکھتے اور سنتے ہوئے آنکھوں اور کانوں

کو بند کر لیا تھا۔ مگر افسوس نرمل تمہاری یہ خاموشی، تمہارے ماتا پتا کی یہ قربانی بھی کوئی پھل نہ لا سکی۔ برات پھر بھی نہ آئی۔ رات کے نو بجے، دس گیارہ، بارہ اور پھر ایک بج گیا۔ اور پھر تم چھلک کر رو پڑیں۔ تمہارے ماں باپ اندر چلے گئے۔ رشتہ دار گھروں کو چلے گئے۔ سہیلیاں تمہیں چھوڑ کر رخصت ہو گئیں۔ اور تم اکیلی اس کمرے میں چلی گئیں۔ جہاں تمہارا جہیز جمع تھا۔ اکیلا کمرہ تھا وہ ——— اور کمرے میں تم اکیلی تھیں۔ اور تمہارے سر پر غموں کا پہاڑ تھا۔ اور جہیز کے سامان میں کئی چیزیں ایسی بھی موجود تھیں جن سے تم بڑی آسانی سے اپنی شہ رگ کاٹ کر اِن بندھنوں اِن اُلجھنوں اور مصیبتوں سے چھٹکارا پا سکتی تھیں۔ مگر تمہاری اس بات یا اس حرکت کا کسی کو دھیان تک نہ تھا۔ اب کسی کو تمہارا رتّی بھر بھی خیال نہ تھا۔ شاید سب جانتے تھے کہ تم جیسی قسمت کی ہیٹی اب جی کر کرے گی بھی کیا؟ شاید ایسا خیال کسی کے دل میں نہ بھی ہو مگر یہ سچ تھا کہ سب نے تمہیں اکیلے اس وقت تمہارے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ تم اندر اکیلی اس پلنگ پر لیٹی لیٹی سِسک رہی تھیں۔ جس پلنگ پر کچھ دیر پہلے بیٹھی تم دل میں خوشیوں کا طوفان دبائے اپنے شوہر کی راہ دیکھ رہی تھیں۔

میں تمہارے لئے پہلے بھی پریشان تھی۔ جب تم اندر بند ہو گئیں تو میرا دل کلپنے لگا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے تمہارے کمرے کا دروازہ تین چار بار کھٹکھٹایا۔ مگر تم نے نہ دروازہ کھولا، نہ کوئی جواب دیا۔ میں ہر بار مایوس ہو کر لوٹ آئی تھی اور دل کے ہول سے مجبور ہو کر پھر تمہارے کمرے کی طرف بڑھ جاتی تھی۔ آخر میں نے ایک راہ ڈھونڈ نکالی۔ تمہارے کمرے کے پچھلے رُخ ایک کھڑکی تھی۔ تم اس کی چٹخنی لگانا بھول گئی تھیں میں اس کی راہ اندر کود گئی۔ اُف میرے بھگوان! جو نظارہ میں نے اندر دیکھا، اس نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ تم نے نائیلون کے ازار بند سے چھت کے پنکھے کے ساتھ ایک پھندہ بنا رکھا تھا اور خود کرسی پر کھڑی پھندہ گلے میں ڈالنے ہی والی تھیں کہ میں نے کرسی کو دھکا دے دیا۔ تم لڑھکتی ہوئی دور جا گریں۔ پھر تم غصہ میں نتھنے پھلاتی ہوئی اُٹھیں اور کھسیانی بلی کی طرح میری طرف لپکیں۔ پھر دوسرے لمحے میرے بال تمہارے ہاتھوں میں تھے۔ ہم کافی دیر ایک دوسرے سے اُلجھے رہے۔ میں تم سے پٹتی رہی۔ آخر تم نے مجھے چھوڑ دیا اور رونے لگیں۔ میں نے اپنے بال سمیٹتے ہوئے بڑے پیار سے کہا، "نرمل! میں تمہاری سہیلی ہوں۔ مجھے بتاؤ، آخر تم چاہتی کیا ہو؟ مصیبتوں سے یوں گھبرانے سے بھلا نبھ سکتی ہے؟"

"مصیبتیں!" تم نے روتے ہوئے کہا، "کوئی حد بھی تو ہو؟ میں نے جتنا دنیا کے مطابق خود کو ڈھالا، اتنی ہی ٹھکرائی گئی۔"

"اس کا مطلب ہے تم بے قصور ہو۔ پھر سزا خود کو کیوں دیتی ہو؟"

"اور کروں بھی تو کیا؟" پھر تم ایک دم سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ تم نے اپنی آنکھیں پونچھ ڈالی تھیں۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تم نے کہا تھا۔ "میرا ایک کام کرو گی؟"

میں نے ہاں میں سر ہلا دیا تھا۔

تم نے کہا تھا، "انو، مجھے ایک چھری لا دو۔ بس اتنی مہربانی چاہتی ہوں۔"

"پگلی!" میں نے پیار سے تمہارے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔ "پگلی تمہارا غصّہ ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا" تم سنجیدہ رہی تھیں۔ "انو تم کہتی ہو۔ میں بے قصور ہوں، پھر سزا خود کو کیوں دوں؟ ہیں نا؟"

میں نے تمہاری آنکھوں میں جھانکا تھا کہ شاید وہیں سے کوئی کہانی تمہارے کہنے سے پہلے پڑھ لوں۔ تم نے کہا تھا: "انو میرے ماتا پتا سے خود ہی اس نے مجھے مانگا تھا۔ مجھے دیکھنے کے لئے وہ ہمارے گھر آیا تھا۔ پھر مجھے کپڑے دینے کے بہانے اپنے ساتھ لے گیا۔ میرا منگیتر تھا۔ اس لئے میں اس سے ملتی رہی۔ لوگوں کی نظروں سے چھپ کر۔ اور آخر ایک دن ۔۔۔ ۔۔۔ مگر میرے ماں باپ نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ اس نے ان کی عزت کیوں مٹی میں ملائی؟ انو میں انتقام چاہتی ہوں مرنے سے پہلے چاہتی ہوں اسے ایک سبق دے جاؤں، تاکہ آئندہ ایسے واقعات دہرائے نہ جا سکیں۔"

میں نے تمہیں ایسا کوئی بھی قدم اٹھانے سے روک دیا تھا کیوں کہ یہ کام خود تمہارے اور تمہارے ماں باپ کے راستے میں پھر سے کانٹے بچھانے کے برابر تھا۔ اور پھر تم نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا تھا، شاید یہ سمجھ کر میں تمہارا کوئی بھی کام نہیں کر سکتی۔ اور میں نے سمجھا تھا کہ تمہیں وقتی غصّہ آیا تھا۔ ٹھنڈا ہو گیا۔ مگر نہیں، میں غلطی پر تھی۔ تمہارے اندر کی آگ ابھی سرد نہ ہوئی تھی ــــ

پھر میرے پتاجی کی بدلی ہو گئی۔ کافی مدت کے لئے ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ ایک دن مجھے اچانک تمہاری چھٹی ملی۔ تم نے لکھا تھا۔ "انو، میں اس جہاں سے دل کی بات دل میں لئے نہیں جا سکتی۔ فوٹو بھیج رہی ہوں۔ اگر کبھی ہو سکے تو اس شخص سے انتقام تم ضرور لے لینا ورنہ میری روح بھٹکتی پھرے گی۔"

اس سے پہلے کہ میں تمہارے بچانے کی کوئی راہ سوچتی، تم اس دنیا کو چھوڑ چکی تھیں۔ دوسرے ہی دن اخبار میں تمہاری خودکشی کی چھوٹی سی خبر تھی۔ تمہاری لاش کے پاس پڑے ہوئے اس فوٹو کا ذکر بھی خبر میں تھا جو تم میرے لفافے میں ڈالنا بھول گئی تھیں۔ کاش تم جانتیں کہ وقت اور جگہ کے فاصلے نے میرے دل میں انتقام کی وہ آگ جو کبھی ذرا سی دیر کے لئے بھڑکی تھی۔ اب سرد کر دی تھی۔ یوں بھی اب میں پہلی کم، بیوی زیادہ تھی، اور بیوی صلح کل ہوتی ہے، کم زور ہوتی ہے۔

نرمل تم تو پرلوک سدھار گئیں۔ مگر میرے لئے تم نے جتنے جی نرک کی جوالا کے دروازے کھول دیئے۔ تم سے ہزاروں میل دور برما کے اس علاقے میں میں نے جب اچانک اپنے خاوند کی ڈائری میں تمہاری اور ان کی اکٹھی فوٹو دیکھی تو تڑپ اٹھی۔ فوٹو کے نیچے میرے خاوند کے ہاتھوں سے لکھا ہوا تھا۔ "وہ مظلومہ جس کے قتل کا ذمہ دار میں ہوں۔"

نرمل یہی تھے وہ حضرت جنہوں نے تمہارا سب کچھ لوٹ لیا تھا۔ میں عجیب کشمکش میں پڑ گئی۔ ایک طرف نو بیاہتا جوڑے کی محبت تھی۔ جس کی گرمی دونوں کو ہر دم لپیٹے رکھتی ہے۔ دوسری طرف تمہاری آتما تھی۔ جو دن رات مجھے اکساتی تھی، بدلہ ۔۔۔ بدلہ ۔۔۔ بدلہ ۔۔۔ ۔۔۔ "تمہاری آنسو بھری آنکھیں مجھ سے فریاد کرتی تھیں۔ غم زدہ چہرہ التجا کرتا تھا، درد بھری آواز منت کرتی تھی، "بدلہ ۔۔۔ بدلہ ۔۔۔ بدلہ ۔۔۔ ۔۔۔" شادی ہوئے ابھی آٹھ مہینے گذرے تھے

کہ تمہاری روح نے محبت کے پودے کو جھلسا دیا۔ میں اُن سے نفرت کرنے لگی۔ نفرت کا یہ زہر میری نس نس میں تیر گیا۔ تمہاری روح میرے اندر سما گئی۔ میں انتقام پر کمر بستہ ہو گئی اور موقع کی تاک میں رہنے لگی۔ لیکن میرا بس نہ چلا۔ وہ اکثر باہر دورے پر رہتے تھے۔ ایک دن وہ آئے تو ان کے ساتھ میرے پتاجی بھی تھے۔ پتاجی کے زور دینے پر اُن کے ساتھ ہندوستان آ گئی۔

لیکن اب میں کیا کروں؟ ہندوستان واپس آنے کے سات ماہ بعد آج میں نے ایک خوبصورت سے بچے کو جنم دیا ہے۔ یہ ننھے ننھے ہاتھوں والا چھوٹا سا کھلونا مجھے کسی اور ہی راہ پر لئے جاتا ہے جو تمہاری راہ سے مختلف ہے۔ ایسا لگتا ہے میں اب تمہارا ساتھ نہیں نبھا سکوں گی۔ محبت کی باڑھ میرے دل کو بہائے لئے جاتی ہے۔ میں اس طوفان کے آگے تنکے کی طرح مجبور ہوں۔

مجھے معاف کرنا نرمل۔ میں کمزور ہوں۔ تمہارا بدلہ نہ لے سکی۔ میں تمہاری گنہگار ہوں۔ مگر تمہارا سینہ وشال ہے مجھے پوری امید ہے کہ تم مجھے ضرور معاف کر دو گی۔ بعض غلطیاں وقت کے ساتھ خود بخود بھی تو معاف ہو جاتی ہیں۔

کہانی بدلتی ہے

افسانہ نگاری کے فن پر میں نے کوئی بیس سال سے اوپر عرصہ تک ریاض کیا ہے۔ اب مجھے گمان ہے کہ میری کہانیاں ایسی ہوتی ہیں جو قاری کو پہلے لفظ سے لے کر آخری لفظ تک اپنی گرفت میں رکھ سکتی ہیں۔ اچھی کہانی کی اس سے اچھی دوسری تشریح میرے پاس نہیں ہے۔ میرے اس خیال کو تقویت تب ملی جب میری بیوی کی چینی دوست سن توئی سوئی اپنی کہانیوں کا پلندہ میرے پاس چھوڑ گئی اور جب میں نے انھیں پڑھا تو مجھے بیس سال کے ریاض کی محنت اور نئی کوشش میں زمین آسمان کا فرق نظر آیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ نئے لکھنے والے اچھی کہانیاں نہیں لکھ سکتے بلکہ کئی بار تو معاملہ بالکل ہی اُلٹا نظر آیا ہے مگر سن توئی کی کہانیوں کے بارے میں میں نے جو کچھ سوچا وہ مجھے بالکل ہی ٹھیک محسوس ہوا۔

سن توئی خود چینی شاہکار کی ایک خوبصورت کہانی ہو تو ہو مگر کہانی کار ہرگز نہیں۔ آپ اسے دیکھیں اور کہیں کہ وہ بھگوان کی لکھی ہوئی ایک خوبصورت نظم ہے تو شاید کوئی بھی آپ کی تشبیہ پر اعتراض کرنے کی جرات نہ کر سکے گا۔ توئی میری بیوی کی دوست ہے۔ یہاں اوسلو سے نکلنے والے تارکینِ وطن کے ایک رسالے میں وہ چینی زبان کے سیکشن کی انچارج ہے اور میری بیوی ہندی سیکشن سنبھالتی ہے توئی کبھی کبھی میری بیوی کے ساتھ ہمارے گھر آجاتی ہے، تو مجھے بھی غلط انداز نظروں سے دیکھ لیتی ہے جب اسے پتہ چلا کہ میں افسانہ نگار ہوں اور اس نے میری ایک کہانی ناروے کے ایک بہت بڑے آرٹسٹ اُلف اوس کی الٹریشن کے ساتھ یہاں کے ایک بہت بڑے رسالے میں چھپی دیکھ لی تو اس نے اپنی کہانیوں کا پلندہ میرے حوالے کر دیا۔ یوں اسے میرے نزدیک آنے کا بہانہ مل گیا۔

مجھے جو بات کہنی ہے وہ شروع سے آخیر تک میرے ذہن میں میرے سامنے بھی پڑی ہے اس لئے اس کا اپنی کہانیوں کو میرے سپرد کرنا مجھے ایک بہانہ ہی لگا ورنہ اس کی کہانیاں ــــــ ان کے بارے میں وہ خود بھی اچھی طرح آگاہ ہے اور میں تو اپنی رائے عرض کر ہی چکا ہوں۔ ایک دن اس بہانے کو پاؤں بھی لگ گئے اور وہ تیور دکھاتے

سے میرے بہت قریب آگیا۔ تونی نے ایک دن میرے دفتر میں مجھے فون کیا اور پوچھا۔ "آج شام کو کیا کر رہے ہو؟"
میں نے کہا۔ "گھر جا رہا ہوں۔"

اس نے آہستہ سے کہا۔ "ہندوستانی پتی دیو! گھر تو تم روز ہی جاتے ہو۔" پھر اونچی آواز سے بولی۔ "آج نہ جاؤ یا ذرا دیر سے چلے جاؤ تو کیا فرق پڑے گا۔"

"بات کیا ہے؟" میں نے پوچھا اور ساتھ ہی دل ہی دل میں کہا تم سندر سہی مگر میرے لئے اب اینٹ اینٹ جوڑا گھر چشم زدن میں برباد کرنا مشکل ہے۔

"میں شام کو تمہارے دفتر پہنچ رہی ہوں۔"

میں چپ رہا تو وہ بولی۔ "ہندوستان کی مہمان نوازی تو بہت مشہور ہے۔ کیا تم مجھے اپنے آپ کسی ریسٹورنٹ چلنے کی دعوت نہیں دے سکتے۔"

راہِ فرار مشکل پا کر میں نے کہا۔ "پزاریا نیپولی کیسا رہے گا؟" راہ فرار کی بات تو خود اپنے ذہن کو سمجھانے کا بہانہ تھی ورنہ میرے من کا چور اندر اندر بھنگڑہ ناچ رہا تھا۔

"تمہارے ساتھ تو میں دوزخ میں بھی جانے کو تیار ہوں!" وہ آہستہ سے بولی۔ پھر اونچی آواز میں کہا۔ "خوب بہت خوب! کہیں بھی لے چلو!"

"تم یہ آہستہ آہستہ کیا کہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

کچھ نہیں۔ میرے ساتھ ایک سہیلی بیٹھی ہے۔ اسے بڑبڑانے کی عادت ہے — تو آج شام میں پہنچ رہی ہوں۔"

پزاریا میں میں نے اپنے لئے پزا مارکوروفی اور سیون اپ کا انتخاب کرنے کے بعد مینو اس کی طرف بڑھا دیا۔ کچھ دیر مینو پر نظریں گھمانے کے بعد اس نے سپیگیٹیز پر انگلی رکھ دی — ریسٹورنٹ کیا تھا جیسے کوئی قلعہ ہو جس میں کئی خانے اور کئی رستے اِدھر اُدھر مڑتے تھے چھپاتے تھے اور پناہ دیتے تھے مگر جسمانی پناہ کے باوجود کانوں کو سماعتی پناہ میسر نہیں تھی۔ ہر طرف اتنا شور، سگریٹوں کا دھواں اور کھانے پینے کی چیزوں کی خوشبوئیں بکھری ہوئی تھیں کہ اس کی بات بمشکل مجھ تک پہنچ پاتی تھی۔ کھانے کے بعد اس نے بیرے کو بل لانے کو کہا اور مجھ سے بولی۔

"یہاں عاشق معشوق کو نہیں آنا چاہیئے۔"

"عاشق معشوق؟" میں نے دہرایا تو وہ بولی۔

"تم بھی کسی کے عاشق ہو گے اور میں بھی کسی کی معشوق ہوں۔ اب ہمیں اپنے اپنے عشق کی بات ایک دوسرے سے کرنی ہو تو بولو اس شور شرابے میں کیسے کریں۔"

میں نے وضاحت کے لئے اس کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگی۔ "تمہاری بیسیوں محبوبائیں ہیں، کہانیاں۔ میرا ایک محبوب ہے ایلفن سن۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے، کچھ سننا ہے۔"

"یہاں اتنے شور میں؟" میں نے پوچھا۔

"اسی لئے میں نے بل منگوا لیا ہے۔" اس نے بل بیرے کے ہاتھ سے لے کر دیکھا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ بل ادا کرتے ہوئے میں نے سوچا جو عورت پیشگی وصول کرنے لگ جاتی ہے، اسے آگے چل کر ضرور کچھ دینا ہوتا ہے مگر کیا میں سچ مچ کچھ وصول کرنے کی نیت رکھتا ہوں؟ خیر نیت چاہے کیسی بھی ہو، کوئی عورت جو اتفاق سے خوبصورت بھی ہو اگر بل سامنے دھر دے تو مرد کو خاموشی سے ادائیگی کر دینی چاہیئے۔

باہر وارڈ روب سے کوٹ حاصل کر کے اسے پہناتے ہوئے میں نے پوچھا "اب؟"

وہ بولی۔ "کسی رولی پلیس (پرسکون جگہ) پر چلیں" پھر مجھے سوچتے دیکھ کر وہ بولی "فراگنر شیسترن، کیسا رہے گا"

"ٹھیک ہے" مجھے کہنا پڑا۔ دل ہی میں نے سوچا۔ واہ ری چھوکری تو نے اوسلو کا سب سے اونچا اکڑی کا بنا۔ کافی مہنگا ریستورنٹ چنا ہے۔"

میری نیلی سترون میں جب وہ میرے ساتھ بیٹھی تو میں نے کہا۔ "بیلٹ باندھ لو۔ کافی اونچائیاں اور موڑ ہیں۔"

"اور بیلٹ نہ باندھنے کا جرمانہ دو سو کرونے ہے۔" وہ بولی۔ "مگر مجھے بیلٹ کی کنڈی نہیں مل رہی ہے۔"

میں نہیں جانتا کہ کار بیلٹ کی کنڈی عورتوں کو سچ مچ نہیں ملتی یا جان بوجھ کر وہ اسے تلاش نہیں کرتیں کیونکہ ان کی سیٹ کی دائیں طرف کنڈی تلاش کرنے کے لئے آدمی کو ان کی دونوں اونچائیوں سے بانہہ گذارنی پڑتی ہے۔ میرے ساتھ ایسا دو بار پہلے بھی ہو چکا ہے۔ مجبوراً میں نے عورتوں کو کار میں لفٹ دینی بند کر دی ہے۔ تب بھی میرے ساتھ یہی ہوا کہ کنڈی تلاش کرنے کو میری بانہہ کو اس کی دونوں پہاڑیوں سے گذرنا پڑا مگر کنڈی میرے ہاتھ نہیں آرہی تھی۔ آخر کافی کوشش کے بعد میں نے اسے اس کے دائیں کولہے کے نیچے دبا ڈھونڈ لیا۔ شکر ہے یہ ناروے ایسا ٹھنڈا ملک تھا اگر برصغیر کا کوئی دیش ہوتا تو میرا تمام خون ابل کر اور نتھر کر میرے ماتھے، گردن اور چہرے کا پسینہ بن جاتا۔

ریستورنٹ کے باہر کار پارک کروانے کے بعد پہلے تو وہ مجھے پہاڑی کے جنگلوں، جھاڑیوں اور پگڈنڈیوں پر گھماتی پھری۔ میں نے کہا "کافی گھنا جنگل ہے۔"

وہ بولی "وڈز کہو۔ جنگل ہوتا تو ہم تم گم ہو جاتے۔"

بہت دیر جنگلی راستوں پر گھومنے کے بعد جب ہمیں سردی لگنے لگی تو ہم ریستورنٹ کی طرف لوٹ آئے دوسری منزل پر ہمیں کھڑکی کے بالکل پاس ایک خالی میز مل گئی جہاں سے اوسلو روشنیوں کا شہر بنا بہت نیچے وادیوں میں ہمارے سامنے ایک جادوئی چادر کی طرح بچھا تھا جس میں لاکھوں رنگ برنگے ستارے ہم سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اس نے نیچے بچھی خوبصورتیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کاش میرے ساتھ آج یہاں ایلفن سن ہوتا!"

مجھے اس کا یہ پچھتاوا اپنی توہین محسوس ہوا مگر وہ کہتی گئی۔ "وہ حرام زادہ آج اس کمینی عورت کی بانہوں

میں سر چھپائے پڑا ہوگا۔"

"کون عورت؟"

"ہے ایک! ایلفن سن کہتا ہے۔ تم اس سے مت جلا کرو۔ اس سے تو میں صرف تحریک حاصل کرتا ہوں۔ لکھنے لکھانے کی خون کی گرمی تو تم سے ہی ملتی ہے۔" انجول تم سچ بتاؤ۔ کیا میں صرف خون گرمانے کی بھٹی ہوں؟ کسی ادیب کی پریرنا نہیں ہو سکتی؟" وہ میری بیوی سے کچھ ہندی کے الفاظ بھی سیکھ رہی تھی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ باہر کی سردی سے آنے کے بعد اس کے گالوں کے انگارے دہک اٹھے تھے۔ ایک پل تو مجھے محسوس ہوا جیسے وہ واقعی ایک گرم انگیٹھی ہے جس پر ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ سینکے جا سکتے ہیں مگر اسے خوش کرنے کو مجھے کہنا پڑا۔ "توئی! تجھے دیکھ کر تو واقعی ذہن میں ہزاروں شعروں کی کھیتی رنگ برنگے پھولوں کی طرح لہلہانے لگتی ہے۔"

"ایلفن سن شعر نہیں کہتا۔ کورس کی کتابیں لکھتا ہے۔ میں تم سے پوچھتی ہوں کیا الجبرا اور جیومیٹری لکھنے کے لئے بھی عورت کی گود میں سر رکھنا ضروری ہے؟"

"بہتر ہے یہ تم اس سے پوچھو۔" میں اور کیا کہتا۔

"کئی بار پوچھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ توئی! دیکھو جب میں تمہارے پاس ہوتا ہوں تو خوابوں میں بھی اس کے پاس نہیں ہوتا اس لئے تم بھی اس کا ذکر مت کیا کرو۔"

"تم اسے چاہتی ہو؟"

"ہاں۔ مردوں سے بھری دنیا میں اگر کسی کو میں نے چاہا ہے تو وہ ایلفن سن ہی ہے۔ اسی کے لئے میں نے ہانگ کانگ چھوڑا اور اتنی دور چلی آئی۔"

"شہر سے یہ ریستورنٹ کتنی دور ہے؟" میں نے سچ بول کر اسے جگانے کی کوشش کی۔ "اور اس وقت تم میرے ساتھ ہو!"

اس نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ وہ بالکل خالی نظریں تھیں اور میرے لئے جاننا مشکل تھا کہ اسے میری بات کیسی لگی۔ ہندوستانی عورت ہنستی ہے تو سمجھو پھنستی ہے یورپین عورت خواہ مخواہ ہی ہنستی ہے مگر پھنستی خواہ مخواہ نہیں ہاں کسی نرالی بات پر اچھل کر آپ کی گود میں آ بیٹھے تو دوسری بات ہے۔ مثلاً آپ کی ناک پکوڑہ ہے۔ رنگ کالا سیاہ ہے۔ بال کانٹے ہیں تو شاید وہ آپ کو ماڈرن آرٹ کا کھردرا شاہکار سمجھ کر قریب سے دیکھنے کے لئے آپ کے بہت قریب آ جائے۔ رات آپ کے ساتھ گذارے اور صبح بائی بائی! ٹاٹا! تم کون ہم کون۔ اگر چینی لڑکی کو کیسے جانا جائے کہ اس کی کونسی ادا ہاں کہہ رہی ہے اور کونسی نہ۔ اس وقت اس کی نظروں سے مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا جیسے وہ ایسی مٹی ہے جس میں کس قسم کا بوٹا لگایا جائے۔ جاننا مشکل ہے ـــــــ یہ جو سوچیں ہیں نا مرد کے ذہن کو کتنی ہی راہیں دکھاتی ہیں۔ پہلے میرے اندر کے جس مرد نے اینٹ اینٹ جوڑے گھر کی فکر میں اسے نظر انداز کرنا چاہا تھا۔ اب ایک بلی

کی طرح جھاڑیوں کی اوٹ چھپتا چھپاتا دبے پاؤں اپنے شکار کی طرف بڑھنے لگا تھا۔

"مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم ایک بے ضرر آدمی ہو" وہ بولی۔

"شکریہ! میں نہیں جانتا یہ تعریف ہے یا تنقید؟ مگر اس وقت تک ہمیں کچھ کھانا بھی لینا چاہئے تھا"

"یہاں کے بیرے بڑے بے فکر ہیں شاید وہ تمہارے پیسے بچانا چاہتے ہیں۔ دیکھئے ادھر کسی کا گذر تک نہیں ہوا!" وہ بولی۔

بہت دیر بعد ایک بیرا نظر آیا تو میں نے اسے بلا کر ٹوٹی سے پوچھا۔ تم کیا لوگی؟"

"صرف ایک کپ کافی!"

دین کوپ کافی۔ تھے اوگ کا کے" میں نے بیرے کو آرڈر دے دیا۔

واپس جانے کے لئے کار میں بیٹھتے وقت مجھے پھر اس کے اردگرد بیلٹ باندھنی پڑی تو کنڈی کی تلاش میں میری بانہہ کو دو پل اس کے گرد دائرہ بنانا پڑا۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ انگاروں کی تپش سے بچنے کے لئے میں نے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ "بہت خطرناک ڈرائیونگ ہے یہاں بہت سے موڑ ہیں"

"زندگی میں کیا کم موڑ ہیں!" وہ بولی۔

کچھ دیر کی ڈرائیونگ کے بعد میں نے کہا۔ "سمیتا موڑ پر میں تمہیں اتار دوں تو چلی جاؤگی؟"

"کیوں دو قدم آگے نہیں آسکتے؟ دیکھو میں تمہارے لئے کہاں تک آ گئی ہوں!" اس کی خاموش آنکھوں نے کہا مگر زبان سے وہ صرف اتنا بولی "وِندرن پاس ہی تو ہے"

وِندرن اس کے گھر پہنچا کر جب میں لوٹنے لگا تو وہ بولی "میری کہانیوں کے بارے میں تم نے کچھ نہیں بتایا۔ دو گھڑی بیٹھ جاتے تو ان کے بارے میں بات ہو جاتی" اور مجبوراً مجھے اس کے ساتھ اندر جانا پڑا۔ اتنا بڑا گھر اور وہ اکیلی! میرے استفسار پر وہ بولی۔ "نارو یجین مالک بزنس پر باہر گیا ہوا ہے اور اس کی بوڑھی بیوی اب اپنے کمرے میں خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہی ہوگی"

اس کی کہانیوں کے بارے ملائم ترین الفاظ میں میں نے اسے جو کچھ کہنا تھا۔ کہہ دیا مگر اس نے مجھ سے کہا۔ "ایک کہانی اور بھی ہے اور وہ یہ کہ میں . . . . ." اور اس نے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں کاغذ پر کچھ لکھ کر میرے سامنے رکھ دیا۔ "میں انتقام میں بھی یقین رکھتی ہوں اور اگر تمہیں یہ لفظ پسند نہ ہو تو مجھے 'نیوگ' پر بھی وشواس ہے۔ مجھے ایلفن سن سے ملے زمانہ ہو گیا ہے"

رات تین بجے جب میں اس کے گھر سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کاغذ پر لکھی جانے والی کہانیوں کی نسبت ان کہانیوں کے پنجوں کی گرفت زیادہ مضبوط ہوتی ہے جو ضمیر کی صاف سلیٹ کو سیاہ کر کے سفید چاک سے لکھی جاتی ہیں اور ان کی کھردری لکھائی ہمیشہ اندر ہی اندر اپنے آپ کو پڑھتی رہتی ہے اور ٹوٹی نے میرے ذہن پر میرے یورپ کے دس سال کے قیام میں پہلی بار ایسی کہانی لکھ دی ہے جو میں نے پہلے کبھی سوچی تھی نہ لکھی تھی۔ ●●●....

مکتی پتھ

یہ کوئی زندگی ہے اِس سے تو مرجانا بہتر ہے۔ دفتر میں کام کرو تو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ دیش آزاد ہوگیا ہے۔ وہی جی حضور، یس سر، یس سر کرتے پھرو تو تم اچھے ورکر ہو اور تمام ترقیوں کے دروازے تم پر کھلے ہیں ـــــ تمہارا کام کوئی نہیں دیکھتا، ہر جگہ تمہاری خوشامد کی داد دی جاتی ہے۔

شام کو تھکے ٹوٹے گھر لوٹو اور محلے میں گھسو تو بدبوؤں کے ریلے اور جھکڑ چاروں طرف سے ناک پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ علاقہ کونسلر کو کئی بار اِس طرف متوجہ کیا ہے مگر اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ جب وہ دروازے پر ہاتھ جوڑے ووٹ مانگنے آیا تھا تو اس سے اس گندگی سے چھٹکارہ دِلوانے کا وعدہ لیا تھا مگر اِن سیاست والوں کا وعدہ ہی کیا، جو وفا ہوگیا۔

گھر گھسو تو بیوی کھانے کو دوڑتی ہے۔ لڑکی جوان ہو رہی ہے تو کیا میں اُسکی جوانی کو بریک لگا دوں۔ عمر نے تو بڑھنا ہی ہے۔ میں نے کیا کیا جتن نہیں کئے اس کے ہاتھ پیلے کرنے کے، کوئی لڑکا راضی بھی تو ہو۔ باپ ہوں اس کا کوئی دشمن تو نہیں کہ شادی کے بعد اُسے آگ میں جھنکوا دوں۔ لڑکے سب بُڈھے ماں باپوں کے غلام ہیں اور بُڈھے جن کے پاؤں قبروں میں لٹکے ہیں، پیٹ میں آنت نہیں، منہ میں دانت نہیں، سونے کا نوالہ کھانا چاہتے ہیں۔ اس سے کم پر تو ان کی بات ہی نہیں ٹکتی۔

مَن کی شانتی کو مندر گوردوارے جاؤ تو وہاں بھی شانتی بھنگ ہو جاتی ہے۔ وہاں بھی ہر کوئی قصہ کرسی کا ہی کہتا نظر آتا ہے اور سُننے کو ہری بھجنوں سے زیادہ سیاسی لیکچر ہی ملتے ہیں۔ پُجاری ہیں تو بھگوان کو بھی بیچ کھانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ بڑا چڑھاوا تو بھگوان کے حضور بڑی سفارش۔ خالی ہاتھ جاؤ تو دروازے پر کھڑے رہو، پُجاری آنکھ تک ملانے کو تیار نہیں ہوتے۔ اُدپر والے کے سب گھر گندی سیاست کے اڈے بن کر رہ گئے ہیں۔

باپ مر رہا ہو اور بینک سے اپنے ہی پیسے نکلوانے جاؤ تو کلرکوں کے باپ مرجاتے ہیں جیسے اُن کی اپنی جیب سے پیسے نکل رہے ہوں، پیسے دینے میں اتنی دیر لگا دیتے ہیں کہ باپ بچ بھی سکتا ہو تو مرجاتا ہے۔

rekhta

دفتر، بس، ٹرین، سکول ہر طرف بے انصافیوں اور رشوتوں کا دور دورہ ہے۔ یہ سب سوچتے سوچتے اُسے لگتا جیسے اُس کے سر میں ہر دم سوچوں کی ایک چکی سی چلتی رہتی ہے۔ آس پاس کوئی سچا ہمدرد، دوست یار رشتہ دار نظر نہیں آتا۔ سب مطلب کے یار ہیں۔ اُس نے سوچا وہ اگر مر جائے تو دنیا کو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ دُنیا کا چکر یوں ہی چلتا رہے گا۔ ہو سکتا ہے اس کی موت پر ترس کھا کر کوئی اس کی لڑکی کا ہاتھ ہی تھام لے۔ لڑکی کے فکر سے اُس نے پوری سات راتیں پلک تک نہیں جھپکی تھی۔ ساتویں دن دفتر میں جانے کیسے اُسے اُونگھ آگئی۔ اور کوئی ضروری کاغذ اس کی میز پر پڑا رہ گیا۔ بس پھر آفیسر نے اُسے وہ لتاڑا، وہ لتاڑا کہ کوئی کتے کو بھی کیا دھتکارے گا۔ تب وہ ایک دم فیصلے کے دوار پر پہنچ گیا۔ اس سے تو مر جانا بہتر ہے اور وہ پاگلوں کی طرح ؎

حالات حاضرہ عذاب ہیں یارب
چھین لے مجھ سے زندگی میری

گنگناتے ہوئے اس نے تیسری منزل سے نیچے سڑک پر چھلانگ لگا دی مگر وہ بال بال بچ گیا۔ نیچے عین اُسی وقت سڑک پر ریت سے بھرا ٹرک آگیا اور وہ بھر بھری نرم اور ملائم ریت میں جا گرا۔ اُسے واپس دفتر لایا گیا اور آفیسر اور سارے سٹاف نے اس کا خودکشی کا کیس یہ کہہ کر دبا دیا کہ اچانک جنگلے سے اس کا پاؤں رپٹ گیا تھا۔

ایک دن اُس نے نیند کی گولیوں کی آدھی شیشی نگل لی مگر دوسرے دن بروقت طبی امداد سے اسے بچا لیا گیا۔

ایک بار خواہ مخواہ کسی بہانے وہ ایک ایسے غنڈے سے بھڑ گیا جس کے لئے بات بات میں چاقو گھونپ دینا ایک مذاق سے زیادہ نہیں تھا مگر غنڈے نے بھی اُسے "جا بابا جا اپنا کام کر" کہہ کر ایک طرف دھکیل دیا۔ اس نے غنڈے کو جوش دلانے کو گالیاں تک دے ڈالیں۔ کمینہ، بدمعاش، لچا لفنگا تک کہہ ڈالا مگر غنڈے نے اسے کچھ بھی نہیں کہا۔ ساتھیوں سے بولا۔ "بڈھا سٹھیا گیا ہے اس کے خون سے میں اپنے چاقو کو شرمسار نہیں کرنا چاہتا" اور اپنی راہ چلا گیا۔

ایک دن وہ بھرے پلیٹ فارم پر گاڑی کے آگے کود گیا مگر وہاں بھی اُسے کسی نے دوسری طرف دھکیل کر بچا لیا اور گاڑی اُس کا بال بھی بیکا کئے بغیر صاف نکل گئی۔

ہر طرف سے مایوس ہو کر اور تنگ آکر اُس نے ایک رات کو زہر پھانک لیا۔ صبح اُسے لگا جیسے وہ دوزخ کی آگ میں جل رہا ہے۔ مگر اس کی آنکھ کھلی تو پیاس سے اُس کا گلا خشک ہو رہا تھا اور نقلی زہر کے معمولی سے اثر نے اُس کے اندر ایک انگیٹھی سی جلا رکھی تھی جو صرف دو پانی کے گلاسوں سے ہی پھس سے بجھ گئی۔

اُن ہی دنوں اُس نے اخبار میں دیکھا، کچھ لوگوں نے کچھ دانشوروں، سیاستدانوں اور دیش بھگت لیڈروں کی ہٹ لسٹیں تیار کر رکھی تھیں۔ اُسے اچانک راہ سوجھ گئی۔ وہ سڑکوں، بس سٹاپوں، ریلوے پلیٹ فارموں اور دوسری پبلک جگہوں پر ہندو مسلم سکھ عیسائی، بھائی چارے پر لمبے لمبے لیکچر دینے لگا۔ دیش بھگتی کے گیت گانے لگا۔ ہندو مسلم بھائی بھائی اور ہندو سکھ بھائی بھائی کے نعرے لگانے لگا۔ وہ وقت بے وقت صبح شام، رات اکیلی سنسان سڑکوں پر سیر کرنے نکل جاتا اور ایک دن بالکل اکیلے کسی سُنسان اور اندھیرے کونے میں کسی نے اُسکی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا۔ ٭

عورت

عمر تو وہ اپنی تقریباً آدھی سے زیادہ کھا چکی تھی مگر ابھی کنواری۔۔ زندگی میں بہت کچھ کیا تھا اور ابھی دل میں بہت کچھ کرنے کے اَرمان باقی تھے مگر وہ جو کسی دانا نے کہا ہے کہ انسان کچھ سوچتا ہے اور خدا کچھ اور کر دیتا ہے۔ جانے کیا ہوا کہ ذرا سی بیمار ہوئی اور دو ہی دِن میں اُس کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

محلے میں اثر و رسوخ اچھا بنا رکھا تھا ۔۔۔ سب سے پیار محبّت سے پیش آتی تھی۔ اور سب کے کام آتی تھی اس لئے پڑوسنوں نے بڑی عزّت سے لاش کو سنبھالا۔ غسل دیا، کفن پہنایا۔ ایک نے چچ چچ کرتے اور ترس کھاتے ہوئے کہا ۔۔۔ "ابھی تو کچی کنواری کلی تھی۔ شادی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اِتنی جلدی بُلاوا آ گیا اور لمبے سفر پر چل پڑی۔" ایک اور بولی ۔۔۔ "اب تو بس بھگوان سے ہی شادی ہوگی۔"

لاش اُٹھ بیٹھی "شادی! سفر!! ابھی تو میں نے میک اَپ بھی نہیں کیا کوئی تیاری بھی نہیں کی۔"

"بیچاری کی یہ حسرت بھی کیوں رہ جائے۔" بڑی بوڑھیوں نے کہا اور حیران و پریشان کچھ عورتیں اس کا میک اَپ باکس، زیورات اور کپڑے اٹھا لائیں۔ وہ بہت دیر تک اپنے آپ کو تیار کرتی رہی۔ جب پوری تسلی ہو گئی تو اچانک دوبارہ دراز ہو گئی۔ اتنے میں پڑوس سے کوئی ڈاکٹر کو بھی بُلا لایا تھا۔ ڈاکٹر نے مکمل چیک اَپ کے بعد اعلان کر دیا کہ وہ سچ مچ مر چکی ہے۔

مدر ٹنگ فادر ٹنگ

ایک موقعہ پر میں نے ایک شخص سے کہا۔ "ست سری اکال۔"
وہ شخص خاموش رہا۔ کیونکہ وہ سکھ نہیں تھا۔

کبھی دوسرے موقعے پر میں نے ایک دوسرے شخص کو نمستے کی۔ وہ بھی خاموش رہا کیونکہ وہ ہندو نہیں تھا۔

کچھ روز بعد میں نے تیسرے شخص سے کہا۔ "السّلام علیکم"۔ وہ مسلمان نہیں تھا اس لئے اُسے بھی سانپ سونگھ گیا

تینوں کو کچھ اور مختلف مواقع پر میں نے وقت کے مطابق گڈ مارننگ، گڈ آفٹر نون یا گڈ ایوننگ کہا تو تینوں نے فوراً میرے انگریزی سلام کا جواب دے دیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا "ست سری اکال" ۔ جس کے معنی ہیں۔ وہ جسے کال یعنی موت نہیں آتی یعنی پرماتما ہی سچ ہے۔ "نمستے" یعنی میں آپکو عزت و احترام پیش کرتا ہوں۔ "سلام علیکم" یعنی تجھ پر خدا کی سلامتی رہے۔ کیا اُن پڑھے لکھے لوگوں کو یہ معنی نہیں آتے تھے یا وہ اُوپر والے ہی کے کائنات کی سب سے بڑی سچائی ہونے کو ماننے سے انکاری تھے یا عزت و احترام پانا نہیں چاہتے تھے یا خدا کی رحمت و سلامتی کے خواہاں نہیں تھے یا اُن کے مذہبوں نے اچھی باتوں کے بُرے معنی اُن کے ذہنوں میں بھاری ہتھوڑے سے کیل کی طرح ٹھونک دیئے تھے۔ دوسرے معنوں میں انہیں اپنی مادری زبان تو نہیں آتی تھی مگر پدری زبان انگریزی کے بولنے میں نہ صرف کوئی ہرج بلکہ فخر بھی محسوس ہوتا تھا۔

دائرہ

مسٹر خورشید! اُردو جانتے ہو؟
ایجوکیشن آفیسر نے پوچھا!
جی ہاں! — بچوں کو پڑھا سکو گے؟ — "جی بالکل" —!
"آپ کا کیا نام ہے؟ آپ کہاں سے ہیں؟؟ آپکو یہ ملک کیسا لگا؟؟؟"

خورشید نے تینوں سوالوں کے جوابات اس نئے مُلک کی زبان میں بالکل ٹھیک ٹھیک دے دیئے۔ سوال پُوچھے بھی تو اسی ملک کی زبان میں گئے تھے۔ "مسٹر خورشید۔ آپ کو بطور استاد چُن لیا گیا ہے۔ آپ کل سے سکول میں پڑھانا شروع کر دیں۔" — "تھینک یُو سر!"

"سنتی ہو، مجھے سکول میں بچوں کو اُردو پڑھانے کی نوکری مِل گئی ہے انٹرویو اتنا آسان تھا، لگتا تھا جیسے میں خود ہی اپنے آپ سے انٹرویو کر رہا تھا۔"

"مگر آپ کو تو اُردو اچھی طرح تو کیا گذارے لائق بھی نہیں آتی۔ اور آپ کی لکھائی تو میں آپ کی بیوی ہو کر بھی نہیں پڑھ سکتی۔ آپ کی تحریر ایسے لگتا ہے جیسے کسی نے مکوڑے کو سیاہی میں ڈبکی دے کر کاغذ پر چلنے کو چھوڑ دیا ہو۔"

"ارے بھئی، بچے ہی تو پڑھانے ہیں۔ کون دیکھ رہا ہے کہ کیا پڑھا رہے ہیں، کیسے پڑھا رہے ہیں۔"

"مگر ٹیچنگ تو ایک مقدس پیشہ ..... اور آپ کا ضمیر" "بس تم چُپ رہو۔ تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو۔ اور مجھے بھینس کا دودھ دوہ لینے دو۔"

"ڈیڈی آپ کا خط۔"

"ارے نہ جانے عینک کہاں رکھ دی، تم ہی پڑھ کر سنادو۔"

"ڈیڈی یہ تمہاری زبان میں ہے" لڑکے نے خط ماسٹر خورشید کے آگے ڈال دیا۔

rekhta

اور ماسٹر جی کو پہلی بار محسوس ہوا جیسے وہ سرکاری بھینس کا نہیں، اپنی ہی بیوی کا دودھ دوہتا رہا ہے
جس سے اس کا اپنا ہی بچہ بھوکا رہ کر کمزور پڑ گیا ہے۔

تمنا کے سُر

وہ دونوں اوسلو یونیورسٹی کے لان میں ماڈرن آرٹ کے جستی نقش کے پاس پتھر کی دیوار پر بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ عورت اور مرد، وہ عورت کہاں تھی۔ وہ تو کچی آمیلی تھی، کھٹی بھی اور میٹھی بھی، جس پر ذرا سی سُرخی ابھی ابھی اُتری تھی، کچھ دیر نارویے کی آل میں رہے گی تو پک کر میٹھا چوس چوس کر کھانے لائق آم بن جائے گی۔ اور مرد، وہ بھی مرد کہاں تھا، بس نیا نیا لڑکپن سے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا جوان تھا، ہر زاویے سے مکمل، ہر نٹ بولٹ سے درست۔ سب نٹ بولٹ سپرنگ کسے ہوئے اور لشکتے ہوئے۔ قریب ہی اُن کے ایک چھوٹا سا کیسٹ ریکارڈر پڑا تھا، جس پر محمد رفیع گا رہا تھا — یہ دُنیا یہ محفل میرے کام کی نہیں۔

تصویر اُن کی یہ "اور گا تا اِس قسم کا یاس آمیز۔ مجھے گُد گُدی ہوئی۔ پوچھا۔ "آپ کب سے یہاں ہیں؟"

"صرف تین سال ہوئے ہیں۔" مرد نے بیوی کی طرف دیکھا۔ "یہ ایک سال بعد آئی تھیں مگر ہمارا یہاں رہنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ بس پانچ سال پلان ہی سمجھ لیجیے۔ کچھ پڑھیں گے، کچھ دیکھیں بھالیں گے پھر واپس لوٹ جائیں گے۔ یہ جگہ ہمارے کام کی نہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ ہم یہاں کے لئے کسی کام کے نہیں۔"

دس سال بعد پھر اُن سے سرِراہے مُنہ بھیڑ ہوگئی۔ کچی کیری اب نہ صرف پکا اور قدرے موٹا آم بن چکی تھی بلکہ OVER
ہو جانے کی وجہ سے اُس پر چھوٹے چھوٹے داغ بھی آگئے تھے۔ گردن تو کبھی صُراحی دار کہی جا سکتی تھی۔ اب چھوٹی RIPE
اور قدرے موٹی ہو گئی تھی۔ جسم جگہ جگہ سے بھر گیا تھا۔ اور مرد، ہاں اُسے اب مرد کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں، سر کے آدھے بالوں سے محروم ہو چکا تھا اور اُسے عینک بھی لگ چکی تھی۔ ساتھ دو بچے بھی تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ میں انہیں پہچان تک نہ سکا۔ ایسے ہی پُوچھ لیا۔ "آپ یہاں کب سے ہیں؟"

"صدیوں سے، مگر اِدھر بچوں نے تعلیم ختم کی اُدھر ہم نے بستر باندھا۔ یہاں پیسے کے سوا ہے ہی کیا۔ بس چند لاکھ بن گئے تو ہم واپس وطن کو کُوچ کر جائیں گے۔ اور وہاں کوئی اپنا کام دھندا شروع کریں گے۔"

اُن کے پاس کوئی ریڈیو یا کیسٹ ریکارڈر نہیں تھا مگر میرے کانوں نے سُنا، کوئی گا رہا تھا۔ اپنے وطن میں سب کچھ

ہے پیاسے - یا شاید یُوں ہی میرے کان بج اُٹھے تھے۔

چند ہی روز بعد شارل یُوہان گاتے، کی واکنگ سٹریٹ پر اُن سے پھر ملاقات ہوگئی۔ اور ہم نے فوراً ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ "کبھی آیئے نا" اور ساتھ ہی اُنہوں نے اپنا ایڈریس کارڈ پکڑا دیا۔ اپنی اپنی مصروفیتوں نے ہمیں دس سال تک نہیں ملنے دیا۔ پھر اچانک ایک دِن اُن کا کارڈ ہاتھ لگ گیا۔ فون کیا۔ وہ تو تقریباً مجھے بھول چکے تھے۔ کچھ یادداشتیں اور حوالے دینے پر بولے۔ "اوہ آپ تو آئے ہی نہیں۔ اچھا کل شام ہی تشریف لایئے اور چائے ہمارے ساتھ پیجیئے"۔

اُن کے بچے اب بڑے ہو چکے تھے۔ لڑکا اپنے باپ اور لڑکی ماں کا جوان رُوپ لگتی تھی۔ اُن کے جوان وجود سے گھر بھرا بھرا لگتا تھا مگر میاں بیوی اَب اِستعمال شُدہ وہ کاریں لگتی تھیں جو چند قدم چل کر رُک رُک جاتی تھیں۔ میاں اخبار میں ڈوبے رہتے تھے۔ اَور بیوی کچن میں یا بُنائی کی سلائیوں سے کُشتی لڑتی صوفے سے چپکی رہتی تھی۔ میں نے پُوچھا۔ "کہیئے کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے" مرد نے ایسے ڈھیلا ڈھالا جواب دیا جیسے سب ٹھیک نہ ہو۔ "بس دس ایک سال اور نکل جائیں۔ پنشن ملے تو وطن کو سدھاریں۔ ریٹائیرڈ لائف وطن میں گذارنے کا ارادہ ہے۔ بُڈھوں کی کیا حالت ہے یہاں۔ کوئی رہنے کا ڈھنگ ہے بھلا۔ پڑے سڑتے رہو، کوئی پُوچھتا تک نہیں"۔

دس سال اور گذر گئے، اَب میاں کی ٹانٹ پندرہ والٹ کا مدھم مدھم چمکتا ہوا بلب بن چکی تھی۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگ چکی تھی اور سہارے کے لئے ہاتھ میں سٹِک آچکی تھی۔ بیوی کے بھی عینک لگی ہوئی تھی اور وہ چلتی تھی تو لگتا تھا جیسے نا برابر پہیّوں والی بگھی اِدھر اُدھر ڈولتی چل رہی ہو۔

"آپ یہاں؟" میں نے پُوچھا۔

"کہاں جائیں۔ بچے یہیں سٹیل ہو گئے ہیں۔ ہم اِس بڑھاپے میں اُنہیں چھوڑ کر اور کہاں جا سکتے ہیں اور اب ہمارا وہاں ہے ہی کون۔ کبھی جاتے ہیں تو اپنے بھی واقف نہیں بنتے"۔

اَور میرے کانوں میں ایک پُرانا فلمی گانا بجنے لگا ؎ جینا یہاں مرنا یہاں۔ اِس کے سِوا جانا کہاں۔
اور ساتھ ہی اچانک میری نظر سامنے شیشے پر پڑ گئی۔ ارے یہ تو اپنا ہی گھر تھا اور اپنا ہی شیشہ۔ اور شیشے نے ذرا بھی جھوٹ نہیں بولا۔ وہ چاروں رُوپ میرے اپنے ہی تھے۔

نتیجہ

بیوی نے کہا فارن آنے کے بعد اب میں آزاد ہوں۔ مرد نے کہا جی بالکل لایا جو ہوں۔ اب بھگتوں گا ۔۔۔ پھر کچھ سال گذرنے کے بعد بیوی کے اصرار پر اُس نے نئے ملک کی شہریت کے لئے عرضی دے دی۔ ایک دن کسی دوسرے رنگ کا پاسپورٹ بیوی کے سامنے رکھتے ہوئے وہ بولا۔ ہمیں اب یہاں کی شہریت مل گئی ہے۔ بیوی جھاڑو دے رہی تھی۔ اُس نے جھاڑو فوراً خاوند کو پکڑا دیا۔ "آج سے تم ۔۔۔۔۔"

خاوند نے بخاموشی بخوشی یہ ڈیوٹی بھی قبول کر لی۔ کچھ عرصہ بعد بیوی نے رائے دی۔ یہاں مونچھیں رکھنے کا رواج نہیں۔ خاوند نے مونچھیں منڈوا دیں۔ اپنے دل کو یوں بہلا لیا کہ اب اُن میں سفیدی جھلکنے لگی تھی ۔۔۔ کچھ عرصہ بعد بیوی نے کہا۔ میں بال کٹوانا چاہتی ہوں۔ خاوند نے پہلی بار احتجاج کیا۔ یہ ظلم مت کرنا میں شروع سے ہی تمہارے لمبے اور ساون کی گھٹاؤں جیسے گھنے بالوں کا دیوانہ رہا ہوں۔ بیوی نے کہا۔ میرے بال میرے اپنے ہیں۔ خاوند نے کہا نہیں تمہارے بال میرے بھی ہیں۔ بیوی سُنی اَن سُنی کر کے ایک دن بال کٹوا آئی۔ خاوند پھر جھک گیا۔ کہا تمہارے یہ کھُلے کھُلے بال تمہارے شانوں پر کسی آبشار کی طرح گرتے بہت خوبصورت لگتے ہیں۔

ایک دن بیوی نے کہا۔ "یہ بال بہت لمبے ہیں"

"ٹھیک تو ہیں" خاوند بولا۔

"آپ کو تو میری کوئی بات اچھی نہیں لگتی" یہ کہہ، ایک دن بیوی بوائے کٹ بال ترشوا لائی

خاوند نے بیوی کا نہیں، اپنا سر پیٹ لیا۔ "ارے تُو نے یہ کیا کیا۔ میرے سب احساسات کا خُون کر دیا"

بیوی نے کہا۔ "نہ جانے آپکو نئے فیشن سے کیوں چڑ ہے۔ کہا ہے نا۔ میرے بال میرے اپنے ہیں"

ایک دن خاوند نہ صرف سر پہ اُسترا پھِروا آیا بلکہ اِدھر اُدھر سے جھاڑیاں بھی گُم کروا لایا۔

بیوی نے کہا۔ "یہ کیا؟"

خاوند بولا ۔ "میرے بال میرے اپنے ہیں"

ایک دِن خاوند جب شام کو دفتر سے گھر نہ پہنچا تو بیوی فکرمند ہوئی۔ پُورے دو دِن بعد واپس گھر تو آیا تو بیوی نے پوچھا۔ "کہاں تھے۔؟"

خاوند نے کہا۔ کہیں نہیں تھانے میں مہمان تھا۔ راستے میں پولیس کسی جھگڑے کے سلسلے میں کچھ پنک لڑکوں کو پکڑ رہی تھی۔ ساتھ مجھے بھی دھر لیا۔ دو دِن خوب خاطر تواضع ہوئی۔

rekhta

نیا رنگ

لاکھوں پتی میاں کے انتقال کے بعد خاتون مشرق نے پہلے تو اُس کی اُنگلی سے خوبصورت اور قیمتی ہیرے کی انگوٹھی نکالی اور ساتھ ہی اُس کی کلائی سے ستر ہزار کی گھڑی بھی اُتار کر جیب میں ڈال لی۔ پھر اُس کے سرہانے کے نیچے سے چابی نکال کر اور اُس کا کمرہ کھول کر اُس کی پرائیویٹ دراز سے اُس کا وصیت نامہ نکال لیا۔ پڑھا تو وہ چونک اُٹھی۔ میاں نے اپنی تمام دولت اپنے سگے فلیٹی کے نام کر دی تھی۔

خاتون نے ایک عرصہ تک یورپ کے اس بڑے اور امیر ملک میں رہنے اور اسی ملک کی شہریت حاصل کرنے کے بعد آنکھیں تو بدل ہی لی تھیں، ساتھ ہی خود کو میم کہلوانا بھی شروع کر دیا تھا۔ نئے پاسپورٹ نے اُسے گوری میم کہلوانے کا حق تو دے دیا تھا مگر اُسکے چہرے کے پاسپورٹ کا رنگ نہیں بدل سکا تھا۔ خاتون پوری طرح کوشاں تھی کہ وہ چہرے کے رنگ سے بھی یورپی میم بن جائے جس کے لیے اُسے گھنٹوں بیوٹیشن کی کرسی پر کسی کسائی بیٹھنا پڑتا تھا۔ پوری گوری بننے کے شوق میں وہ یہ سب دِل دہی ہنسی خوشی برداشت کر لیتی تھی مگر اندر کی کالی کھال اُس کے چہرے پر اپنے ہی رنگ کے بیل بوٹے پیدا کرنے سے باز نہیں آتی تھی، اِس کے باوجود اُسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دِن اُس کی کوششیں ضرور رنگ لائیں گی اور وہ نہیں تو اُس کی اگلی نسل مکمل یورپی میم یا صاحب بن جائے گی۔

وصیت نے خاتون کے ہوش اُڑا دیے۔ اُس نے تو اپنی پوری بھری پُری جوانی بڈھے میاں کے حوالے کر دی تھی۔ اُن کی عمروں میں فرق تو صرف چار سال کا تھا مگر میاں کو بزنس کی بھاگ دوڑ نے وقت سے پہلے بوڑھا اور بیمار کر دیا تھا جبکہ خاتون کے قسم قسم کے میک اَپ نے اُسے اُسکی اصلی عمر سے کچھ کم اور جوان دِکھانا شروع کر دیا تھا۔ اِسی لئے خاتون خود کو جوان اور اُسے بوڑھا سمجھنے کے اپنے فعل کو جائز قرار دیتی تھی اور اِسی بات کی آڑ اور گورے رنگ کے شوق میں کبھی کبھی بڈھے کی غیر حاضری میں اُس کی طرف اپنی دفا میں تھوڑی سی ڈنڈی بھی مار لیتی تھی یعنی جتنے بھی گورے مرد میاں کے بزنس دوست تھے، خاتون کے ذاتی دوست بن گئے تھے۔ بہر حال چمکتی ہوئی چیز اپنی طرف کھینچتی ہی ہے اور اگر اُس چمکیلی چیز میں خود ہی بے انتہا کشش ہو تو دوسرا کیا کرے۔

وصیت کے کاغذات حاصل کرنے کے بعد خاتون نے اپنے ایک گورے وکیل دوست کو فون کیا اور اس کی رائے چاہی۔ وکیل جو اُس کے میاں کا دوست بھی تھا نے اُسے بتایا کہ میاں نے وصیت کی ایک نقل خود اس کے پاس بھی کورٹ کے ذریعے رجسٹر کروا رکھی ہے۔

"پلیز ہیلپ می۔ اِس طرح تو ساری دولت ہاتھ سے نکل جائے گی" خاتون گڑگڑائی

"اِس میں میں کیا کرسکتا ہوں۔ سب قانونی معاملہ ہے" وکیل نے مجبوری ظاہر کی۔

"تمہاری فیس میں ہر طرح تن من دھن سے ادا کرنے کو تیار ہوں" شروع سے ہی وکیل اُسکی پسند کی کسوٹی پر ہر طرح سے پورا اُترتا تھا۔

"کیا خیال ہے اگر میں بانس ہی ختم کردوں تو کیا پھر بھی بنسری نج سکے گی" اُس نے اپنے رقیب فیلیٹی کی طرف نفرت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ اِس طرح تو تم اور مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔ شاید تم نے وصیت اچھی طرح نہیں پڑھی۔ اِس بات کا بھی نعم البدل وصیت میں تحریر ہے" وکیل نے اُسے سمجھایا۔

خاتون وکیل کی گود میں چڑھ بیٹھی اور بڑی ادا سے بولی "کچھ کرو نا ڈیئر تم کیسے وکیل ہو"

اور وکیل کے قلم نے ایک نئی تحریر سے ایک نیا رُخ موڑ دیا۔ اُس نے اپنی مطلوبہ فیس، وہی تن من دھن، جس کا خاتون نے وعدہ کیا تھا، کے عوض اُسے ایک نئی راہ سمجھا دی — اب خاتون نے فیلیٹی کی بیوی بن کر ایک تیر سے دو شکار مارنے تھے۔ وہ نہ صرف راتوں رات لاکھوں پتی بن گئی تھی بلکہ آنے والی نسلوں کو گورا رنگ دے سکنے کا گُر بھی جان گئی تھی۔

سُنا ہے اُس کے نئے امیر شوہر فیلیٹی کو ان جھنجھٹوں سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ وہ تو اپنی برادری کی وفاداری کی روایت کو نبھاتے ہوئے اپنی خود غرض بیوی کو مالکن ہی سمجھتا ہے۔

کبیرا ہنسا بھی اور رویا بھی

اُردو ادیب نے اپنے ڈھائی سو صفحات کے ناول پر پبلشر سے ڈھائی پیسے یومیہ معاوضہ کی پیش کش پر پہلے تو تبسم کیا پھر زار و قطار رونے لگا۔

مدیر مع پبلشر نے کہا۔ اگر آپ ہمارے دفتر میں بیٹھ کر اِس طرح رونے لگیں گے تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ ہم نے آپ کے ساتھ کوئی بُرا سلوک کیا ہے جبکہ ہم اپنے اصول کے خلاف آپکو آپکی تخلیق کا معاوضہ بھی دے رہے ہیں۔

ادیب کے ہونٹوں پر مدھم مدھم مُسکان تیر گئی۔ وہ روتی اور ہنستی ہوئی آواز میں بولا "میں رو اپنے لیے رہا ہوں کہ چالیس سال قلم گھِسا گھِسا کر میں نے جھک ماری ہے۔ آپ کے لیے تو ہنس رہا ہوں" اُس کی رُلاہٹ اور مُسکراہٹ کا رُوپ ایسے تھا جیسے ہلکی ہلکی بارش بھی ہوتی رہتی ہے اور اُس میں میٹھی میٹھی دھوپ بھی نکل آتی ہے۔

"آپ مجھے کچھ بھی معاوضہ نہ دیں صرف میرے ان کاغذات اور قلم دوات وغیرہ جن سے میں نے یہ ناول تحریر کیا ہے اور بجلی کا وہ بل ادا کر دیں، جو میں نے اِسے لکھتے ہوئے پورے ایک سال تک جلائی ہے یا پھر میری اس ایک سال کی محنت پر کھوئی بینائی اور پہلے سے زیادہ موٹی عینک لگ جانے کی قیمت ہی ادا کر دیں"

بڑا دفتر، قسم قسم کے کیمرے، فرنیچر، کاریں اور خود آپ کا یہ اِدارہ کہ ہمارا رِسالہ ہزاروں کی تعداد میں چھپتا اور دُنیا کے آٹھ دس مُلکوں میں پہنچتا ہے، کو بھول کر آپ مجھے کچھ بھی نہ دیں۔ میں کیچوے کی طرح مٹی چاٹ کر گزارہ کر لوں گا اور پھر اُس مٹی کو اُگل کر بہترین کھاد کی صورت واپس مٹی میں شامل کر دوں گا تاکہ اس سے پھر خوبصورت اور رنگ برنگے اَدبی پھل اور پھول پیدا ہوتے رہیں کہ اُوپر والے نے ادیب بنا کر مجھے یہی فرض سونپا ہے۔

اور میں ہنسا اس لیے بھی ہوں کہ آج مجھے معلوم ہوا کہ میں کتنا امیر و کبیر ہوں کہ ایک لاکھوں پتی مدیر اور پبلشر بھی میرے آگے ہاتھ پھیلائے میری تخلیق ایک بھیک کی طرح مجھ سے مانگ رہا ہے اور میں غریب ادیب ہو کر بھی اُسے بھیک دے سکنے کی پوزیشن میں ہوں۔

آپ کا کئی اِنچ آگے بڑھا ہوا پیٹ چغلی کھا رہا ہے کہ اس میں اس کے سائز سے کچھ زیادہ ہی ٹھونسا جاتا رہا ہے

rekhta

مگر آپ کا خود کو شعو کا بتانا اب مجھے آپکو شعو کا سمجھنے پر مجبور کر رہا ہے تو لیجئے میں آپ کا شاہانہ معاوضہ بھی لوٹائے دیتا ہوں اگر آپکو شرم آئے تو آپ بھی میری فائیل واپس کر دیں اور اگر نہ کرنا چاہیں تو بھی کوئی بات نہیں میں اب کٹنے کا عادی ہو چکا ہوں۔

rekhta

کتاب

اُسے گھومنے پھرنے، محفلیں سجانے، سگریٹ، تاش، کافی، چائے کسی چیز کا شوق نہیں تھا۔ بس ایک نئی نئی خوب صورت کتابیں خریدنے، پڑھنے اور گھر میں ایک لمبی چوڑی خوبصورت سی لائبریری بنانے کا جنون تھا۔ کوئی کتاب کتنی ہی مہنگی کیوں نہ ہوتی وہ اِدھر اُدھر کے تمام اخراجات میں کٹوتی کرکے کسی نہ کسی طرح خرید ہی لاتا۔

اُس کا ایک دوست تھا۔ جس نے اُسے کتابوں کی دُنیا میں انتہائی مصروف دیکھ کر ایک غرض کے تحت اُس سے دوستی لگائی تھی۔ جب دونوں میں خوب گاڑھی چھننے لگی اور بے تکلفی بڑھنے لگی تو اُس کے دوست نے ایک دن اُس کی لائبریری پر سرسری نظریں ڈالتے ہوئے پُوچھا۔ "کیا تم نے سب کتابیں پڑھ لی ہیں؟"

"ہاں۔ سب ہی میں بہت ہی خوبصورت اور گہری باتیں لکھی ہیں۔"

"کیا سچ؟" دوست نے پُوچھا۔

"کیوں تمہیں کوئی شک ہے۔ میں صرف سجاوٹ کے لئے کتابیں جمع نہیں کرتا۔"

"شک تو ہے۔۔" دوست نے کہا۔ "اگر میں ثابت کردوں کہ اِس گھر کی لائبریری کی سب سے خوبصورت کتاب کو تم نے اچھی طرح سمجھا اور نہ ہی پڑھا ہے تو کیا وہ کتاب مجھے بخش دوگے؟"

اُس نے اپنی ساری لائبریری کی ایک ایک کتاب پر نظریں دوڑائیں اور جب اُسے یقین ہوگیا کہ اُس نے سب کتابوں کو نہ صرف پڑھا بلکہ اچھی طرح چاٹ رکھا ہے تو کہا۔ "بالکل۔"

"میرا مطلب تمہاری خوبصورت بیوی سے ہے۔" دوست نے کہا۔

وہ چونکا۔ آج دوست نے کس قسم کی عجیب بات کہہ دی ہے مگر دوست نے اِتنے پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ اس کی بیوی کی کچھ ایسی باتیں نمونوں کے ساتھ اُسے بتا دیں، جنہیں سُن کر اُس کا منہ کُھلے کا کُھلا رہ گیا۔

ایمرجنسی

وہ قصبہ تو چھوٹا سا تھا مگر ملک کی سرحد پر واقع ہونے کی وجہ سے اُس کے باسی کچھ ایسی ویسی کمائی سے کافی خوشحال تھے۔ تینوں مذہبوں کے لوگ آپس میں تو کیا لڑتے، اُنہیں تو پڑوسی ملک سے جنگ کرنے سے بھی انتہائی نفرت تھی کیونکہ جنگ شروع ہونے سے پہلے اور بند ہونے کے بعد بھی کافی عرصہ تک اُن کے گھروں میں آتی دولت کو روک دیتی تھی۔ سرحد نے اُنہیں آپس میں اور پڑوسی ملک سے سُکھ اور شانتی کے ساتھ رہنا سکھا دیا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ چوری چھپے ایک دوسرے کی شادی غمی میں بھی شریک ہو لیتے تھے۔

جب پیسہ ایسے ویسے طریقوں سے آتا ہے تو لوگ اوپر والے کو بھی ساتھی بنانے کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ قصبے کے ہندو، مسلم اور سکھوں نے سوچا۔ اُن کے پاس اور تو سب کچھ ہے، اپنے اپنے مالکوں کے گھر نہیں ہیں۔ جب ایک بار ایسی سوچ دماغوں میں آ گئی تو نیک کام میں کون پیچھے ہٹتا۔ ایمان کی حرارت والوں نے دِنوں کو مہینوں سے آگے نہیں بڑھنے دیا اور مناسب جگہیں چُن کر اپنے اپنے مندر، مسجد اور گوردوارے کھڑے کر لئے۔ اتفاق یہ ہوا کہ تینوں پرستش کدے کافی نزدیک نزدیک بن گئے مگر قصبہ کے لوگوں میں اِس قدر اِتفاق اور میل جول تھا کہ لڑائی تو دُور کی بات ہے لڑانے والے مذاہب بھی ان میں کسی قسم کی دراڑ تک نہ ڈال سکے۔ خوش قسمتی سے بھگوان، اللہ اور گورو مہاراج کے گھروں کے لئے اُنہیں پُجاری، مُلا اور گرنتھی بھی اچھے لوگ مل گئے جو اُن میں اِتفاق اور میل ملاپ سے رہنے کا پرچار کرتے اور اُنہیں اور قریب لانے کے جتن کرتے رہتے۔ ہاں کبھی کبھی وہ لوگ دان دکشنا کی کمی کا گلہ ضرور کرتے۔ ویسے تو اُنہیں کسی چیز کی کمی نہیں تھی مگر قصبے والوں کی بے پناہ آمدن کو دیکھ کر انہیں خواہ مخواہ اپنی غریبی کا احساس ہونے لگتا۔ دوسرے لوگوں جیسی کمائی کے راستے وہ خود تو اپنا نہیں سکتے تھے اِس لئے دان دکشنا کی کمی کی شکایت کے سوا اُن کے پاس اور چارہ ہی کیا تھا۔

بھگوان کے نئے گھروں میں اپنی پریکٹس سے ناخوش وہ سوچ ہی رہے تھے کہ وہاں رہیں یا کسی دن چُپ چاپ کہیں اور کھسک جائیں کہ ملک میں ایمرجنسی لگ گئی جس کا اثر یہ ہوا کہ ہر چیز بڑی آسانی سے دستیاب ہونے لگی، دفتروں میں کام بھی بڑی تیزی سے اور ٹھیک ٹھاک ہونے لگا اور لاکھوں اور کروڑوں روپے کا کالا دھن بھی برآمد ہونے لگا۔ ایمرجنسی

rekhta

اپنی اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ قصبے پر بھی اثر انداز ہوئی۔

ایمرجنسی نے اُوپر والے کے تینوں ایجنٹوں کو اب اور زیادہ شیر و شکر کر دیا کیونکہ قصبے والے قانون کی گرفت میں آنے سے بچنے کے لئے اپنی ایسی ویسی رقمیں اپنے اپنے خداؤں کے قدموں میں اَرپن کرنے لگے۔

قصبے والوں کو ایمرجنسی کا کڑوا گھونٹ تو کسی نہ کسی طرح برداشت کرنا ہی تھا مگر اُن تینوں اُوپر والے کے گھروں کے رکھوالوں کے ایمرجنسی کے حق میں بیانات اور پرچار اُنہیں بہت اکھرتے تھے۔

دکان

وہ لوگوں کی فریادیں بڑی ہمدردی سے گلوگیر آواز میں بھگوان کے گوش گذار کرتا۔ بھگوان سے پرارتھنا کرتے کرتے اُس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔ آواز میں اتنا درد بھر جاتا جیسے اُن کی تکلیف خود اُس نے اپنے اُوپر اوڑھ لی ہو اور اُن کا دُکھ درد اُس کا اپنا دُکھ بن گیا ہو۔ فریاد کرتے ہوئے بعض اوقات تو وہ زار و قطار رونے بھی لگ جاتا۔ "ہے پرمیشور۔ بھگت جنوں کے دُکھ نِوارن۔ اِنکے سب دِلدر دُور کر دے۔"

لوگ اُس کی درد بھری فریاد سے اتنے متاثر ہوتے کہ کام ہونے سے پہلے ہی اُس کے سامنے دان دکشنا کے ڈھیر لگا دیتے اور کام ہو جانے پر تو پجاری بابا کا مُنہ موتیوں سے بھر دیتے۔

مندر میں بیس سال سے پُوجا کرتے کرتے اور دُکھی جنوں کی فریادیں بھگوان تک پہنچاتے پہنچاتے تجربے نے اُسے ایک ماہر نفسیات دان کی طرح ہر بھگت کی زندگی کا ایک ایک راز کُھلی کتاب کی طرح پڑھنا سِکھا دیا تھا۔ وہ غرض مندوں کا چہرہ دیکھتے ہی ایکس رے مشین کی طرح اُن کے اندر کا سب کچھ دیکھ لیتا۔ کون دُکھی ہے اور کون سُکھی؟ کوئی زیادہ اولاد کے ہاتھوں، کوئی اولا نہ ہونے کی وجہ سے، کوئی روزگار کی تلاش میں اور کون بیماری کے ہاتھوں لاچار ہے۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ایک دن بھگوان مُکٹ پہنے مجسم اُس کے مندر میں آ براجے۔ "پجاری۔ آج قصبے کے سب لوگوں کو بُلاؤ۔ آج میں ہر ایک کا ہر دُکھ دُور کرنے سو بُم یہاں آیا ہوں اِس کے بعد یہاں کوئی دُکھی نہیں ہوگا۔ آج سب کی منوکامنا میں پُوری کر دونگا۔"

بھگوان کو مجسم اپنے سامنے حاضر و ناظر دیکھ کر پہلے تو پجاری کے ہوش اُڑ گئے مگر تھوڑی دیر بعد سنبھل کر بولا۔

اُنتریامی۔ تم تو دِلوں کی جانتے ہو۔ کیوں میرے پیٹ پر لات مارتے ہو۔ تم زندہ ہو جاؤ گے تو میں مر جاؤں گا۔

"نہیں میں سب کے دِلدر دُور کر کے تمہیں اپنے ساتھ اُوپر لے جاؤں گا۔ سُورگ میں پہلے ہی تمہاری سیٹ ریزرو کرا آیا ہوں۔"

پجاری اور بھی زیادہ گھبرا گیا اور اِس سے پہلے کہ گھبراہٹ میں اُس کے دِل کی حرکت بند ہو جائے بھگوان

انتردھیان ہو کر اپنی مورتی میں لین ہو گئے۔ شام کو حسبِ معمول جب کتھا کیرتن اور پاٹھ پوجا کا دور چلا تو بھگوان پھر سے پرگٹ ہو کر سب کے سامنے اپستھت ہو گئے۔ "بھگت جنو۔ میں بھگوان ہوں۔ تمہارا اصلی بھگوان، جس کے سامنے تم ہر روز اپنی فریادیں پیش کرتے ہو۔ آج میں تم سب کے دلدر دور کرنے آیا ہوں۔ آؤ اور اپنی اپنی فریادیں پیش کرو۔"

پجاری نے اپنی زندگی بھر کی کامیاب ترین اداکاری کے تمام گُر بروئے کار لاتے ہوئے چلا کر کہا۔ "بھگت جنو۔ اس کے بھرے میں نہ آنا۔ یہ غنڈہ بھگوان بنا صبح سے مجھے پریشان کر رہا ہے۔"

اور پجاری نے چند ہمدردوں کے ساتھ اصلی بھگوان کو دھکے دے کر مندر سے باہر نکال دیا۔ اس دن پجاری اور بھگتوں نے معمول سے اور زیادہ زور و شور سے گھڑیال اور گھنٹوں کی کان پھوڑ آوازوں میں پتھر کے بھگوان کی آرتیاں گائیں۔

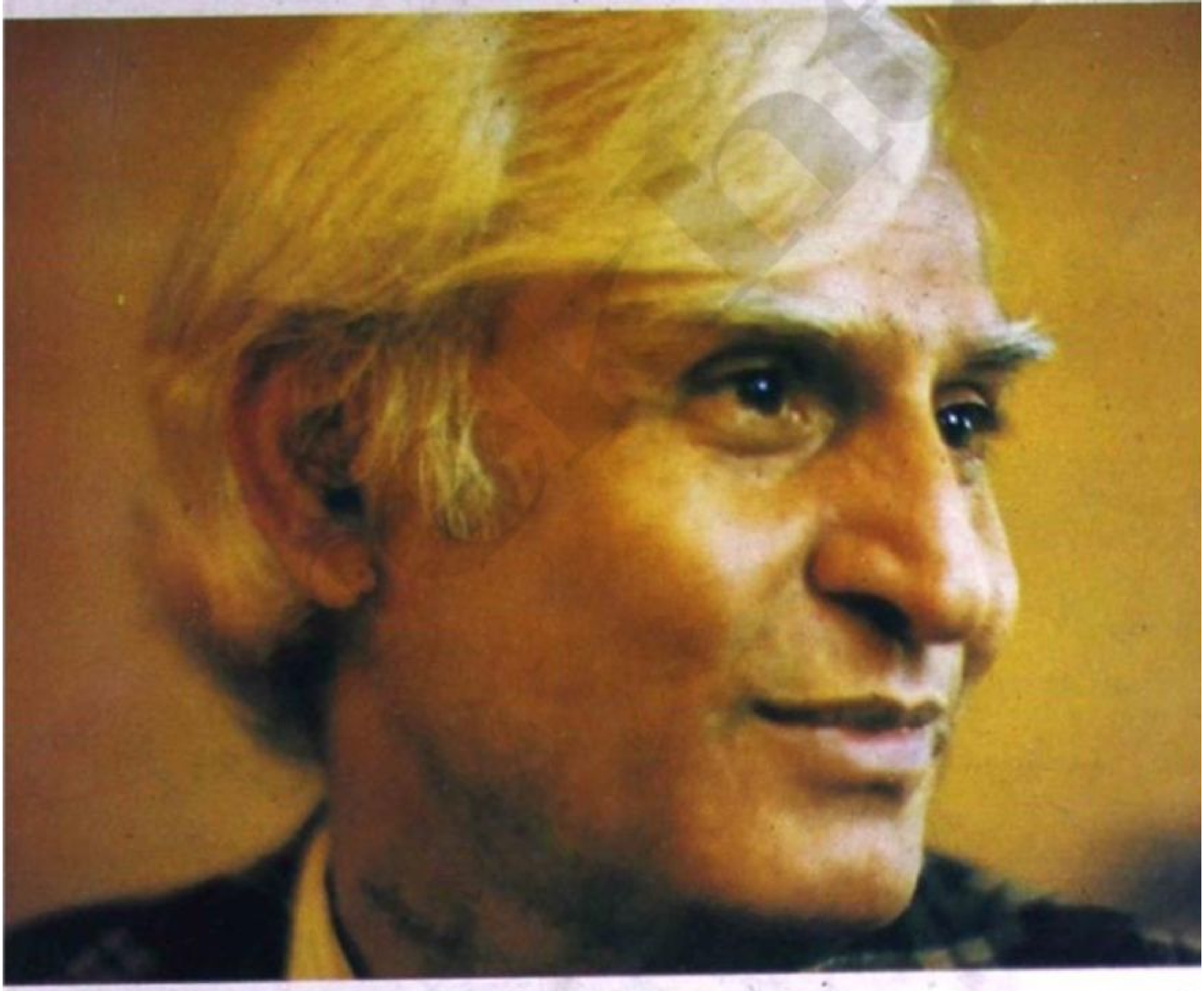

IDARA FIKRE-JADID
1st Floor, 922, Rohella Street,
Darya Ganj, New Delhi-110 002